مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

شمارہ ۷	رمضان ۱۴۳۵ھ / جولائی ۲۰۱۴ء	جلد ۱۵

احکام العشر الاخیرہ

رمضان کے آخری عشرہ کے احکام

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ = / [illegible] روپے زر سالانہ = / [illegible] روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
[illegible]
پتہ دفتر
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ (رجسٹرڈ)
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور پاکستان

(احکام العشر الاخیرہ)

(رمضان کے آخری عشرہ کے احکام)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	فضیلت ماہ رمضان	۹
۲	نزول قرآن کریم	۱۰
۳	تدریجی نزول قرآن کا فائدہ	۱۱
۴	سابقہ کتب کا نزول	۱۲
۵	عالم غیب کی وسعت	۱۴
۶	کشف اور بزرگی	۱۵
۷	لیلۃ القدر	۱۷
۸	جمعہ کی فضیلت	۱۹
۹	محبتوں میں فرق	۲۱
۱۰	تلاوت کی اہمیت	۲۳
۱۱	بغیر سمجھے قرآن پڑھنے کا فائدہ	۲۴

۱۲	حال وقال کا فرق	۲۵
۱۳	نسبت انعکاسی	۲۷
۱۴	توجہ متعارف کے نقصانات	۲۷
۱۵	فیض رسانی کی صورتیں	۲۹
۱۶	توجہ کی اقسام	۳۰
۱۷	حقیقت توجہ	۳۰
۱۸	منصب ہدایت	۳۱
۱۹	شبہ کا جواب	۳۲
۲۰	جاہل واعظین	۳۳
۲۱	اہلیت ارشاد	۳۴
۲۲	تصور شیخ	۳۵
۲۳	ثواب قرأت قرآن	۳۸
۲۴	اجرت تعلیم	۴۰
۲۵	اجرت امامت	۴۲
۲۶	دیدار خداوندی	۴۲
۲۷	تلاوت قرآن کا لطف	۴۵

۲۸	ترغیب ذکر اللہ	۴۷
۲۹	طالبین کا حال	۴۹
۳۰	طلب الٰہی کی ترغیب	۵۰
۳۱	ترتیب سلوک	۵۳
۳۲	نرمی وسختی علاج کے دو طریقے	۵۴
۳۳	شبان موسیٰ کا قصہ	۵۴
۳۴	تفریط متعلمین	۵٦
۳۵	افراط معلمین	۵۷
۳٦	فضیلت عشرہ اخیرہ	۵۸
۳۷	شب قدر کی فضیلت	٦۱
۳۸	فضیلت اعتکاف	٦۲
۳۹	فضیلت خدمت والدین	٦۵
۴۰	ماں باپ کی شفقت	٦٦
۴۱	شبہ کا جواب	٦٦
۴۲	ماہ رمضان کی فضیلت	٦۷
۴۳	بے علم واعظوں کی غلطی	٦۸

۴۴	ایناد نگر کا قصہ	۶۹
۴۵	قانون خداوندی	۷۱
۴۶	توبہ کی ترغیب	۷۱
۴۷	ختم قرآن پر شیرنی	۷۲

t

وعظ

(احکام العشر الاخیرہ)

(رمضان کے آخری عشرہ کے احکام)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے وعظ ''احکام العشر الاخیرہ'' ۲۱/ رمضان ۱۳۲۹ھ کو بروز جمعہ بعد نماز جمعہ تا نماز عصر جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا حاضرین کی تعداد ۱۰۰ افراد پر مشتمل تھی حضرت مولانا سعید احمد تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

رمضان المبارک کے عشرہ اخیرہ کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور رمضان المبارک کی برکتوں سے ہمیں بہرہ ور فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

17-12-2013

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل له ومن یضلله فلا ھادی له ونشھد ان لا الٰه الا اللّٰہ وحدہ لا شریك له ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسوله صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وعلیٰ اٰله واصحابه و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ﴾(۱)

''ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے اور (دوسرا وصف) واضح الدلالہ ہے منجملہ ان کتب کے جو (ذریعہ) ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی بھی ہیں''۔

فضیلت ماہ رمضان

یہ ایک آیت کا ٹکڑہ ہے اس آیت میں خدا تعالیٰ نے رمضان کی ایک فضیلت کا بیان فرمایا ہے۔ گزشتہ جمعہ میں رمضان کے ضروری آداب وحقوق کا بیان ہو چکا ہے۔ آج رمضان کے ایک خاص جزو یعنی عشرہ اخیرہ کے متعلق بیان کرنا

(۱) سورۃ الفرقان:۱۸۵۔

مقصود ہے۔ اس آیت سے بظاہر عشرہ اخیر کے مضمون کو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن غور کیا جائے تو عشرہ اخیرہ سے اس آیت کا تعلق معلوم ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان کی جو فضیلت بیان کی ہے اسی فضیلت میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ فضیلت عشرہ اخیرہ کے لئے بدرجہ اولیٰ واتم ثابت ہے۔

فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ایسا اور ایسا ہے۔ سو اس آیت سے اس قدر معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ رمضان تیس دن کے زمانہ کا نام ہے اور اس آیت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل زمانہ کے کس جزو میں نزول ہوا ہے لیکن اگر ہم اس کے ساتھ دوسری آیت کو بھی ملا لیں تو دونوں کے مجموعہ سے تعیین وقت بھی ہم کو معلوم ہو جائیگی۔ سو دوسری آیت میں فرماتے ہیں ﴿انا انزلنه فی لیلة القدر﴾ ''بیشک قرآن کو ہم نے شب قدر میں اتارا ہے'' پس ان دونوں آیتوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کا نزول ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔

رہا یہ شبہ کہ ممکن ہے شب قدر رمضان میں نہ ہو تو اس صورت میں دوسری آیت کا ضم (۱) مفید نہ ہوگا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو شب قدر کا رمضان میں ہونا حدیث میں موجود ہے۔ اس سے قطع نظر اگر ہم ذرا فہم سے کام لیں تو ان دونوں آیتوں سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ شب قدر رمضان میں ہی ہے۔

نزول قرآن کریم

اس لئے کہ کلام مجید کا نزول دو طرح ہوا ہے۔ ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے

(۱) ملانا۔

خود کلام مجید سے ہوتا ہے۔ ﴿لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ (۱) یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد ﷺ نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب پوری کی پوری دفعۃً آسمان سے کیوں نہیں دی گئی۔ جس طرح موسی d کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ ان کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعہ سے آپ کے دل کی تشبیت اور اس کا محفوظ کر لینا اور سمجھ لینا آسان ہو جائے۔

واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تشبیت فواد اور ضبط وفہم بتدریج (۳) نازل کرنے میں ہوسکتا ہے نزول دفعی میں نہیں ہوسکتا۔ دفعۃً نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعۃً نازل کیا جائے گا تو یقیناً اس کا احکام امور کلیہ ہوں گے (۴) اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے گا۔ سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے بآسانی تعلیم ہو جائیگی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر رہ جائے گا۔ اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاریٰ اور یہود سے ہوئیں۔

تدریجی نزول قرآن کا فائدہ

اس تفاوت کی ایسی مثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آئے

(۲) سورۃ الفرقان: ۳۲ (۳) دل میں جم جانا یا دکرنا اور سمجھنا تدریجا نازل کرنے میں ہوسکتا ہے ایک دم نزول میں نہیں ہوسکتا (۴) اس کے احکام اصول کے درجہ میں ہوں گے۔

اور اپنی حالت بیان کر کے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا۔ نہ میں وقتاً فوقتاً آ کر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کر سکتا ہوں۔ آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخے مجھے لکھ دیجئے۔ جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جائے اور مرض میں کمی یا بیشی ہو میں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں۔ پس اس صورت میں اگرچہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو۔ اور کتنے ہی غور وخوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہوسکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے۔ اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھلاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر وتبدل کمی بیشی کرالے جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخہ جات لکھ دیئے لیکن تغیرات کی تعیین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رأے العلیل (۱) ہونے کی وجہ سے نا قابل اعتبار ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ زیادتی صفرا کی ہو اور وہ سودا کا ہیجان سمجھ جائے اور چستی سنبھالنے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جائے۔

اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ جس قدر عام اور تام فائدہ جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر تبدل کرنے میں ہے۔ امور کلیہ سمجھا دینے میں اس قدر فائدہ نہیں۔ اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں۔ بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید جزء جزء نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا۔ اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا۔

سابقہ کتب کا نزول

یہاں بظاہر دو شبہات ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ جب تدریجی نزول میں اس

(۱) ایک بیمار کی رائے ہونے کی وجہ سے قابل التفات نہیں۔

قدر فائدہ اور دفعی (۱) نزول سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا امم سابقہ کے مصالح کی رعایت نہیں کی گئی۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جن سے تمام جزئیات حل ہوجاتی تھیں۔ اس لئے کتب سابقہ کا دفعۃً نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضر نہیں ہوا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ باوجود قرآن کے تدریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطا میں اور امم سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے۔ ان سے زیادہ اور مضر غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں۔ وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے (۲) جس کو تعیین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعیین مراد کے بعد کی غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعیین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بلا تعیین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے ۔ بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بیان سے تعیین ہوجاتی تھی۔ سو اول تو انہوں نے اس کی حفاظت نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا۔ مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعیین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا۔ اس میں حکمت تھی توسیع مسالک کی۔ پس وہ رحمت ہوا۔ پس دونوں میں فرق ظاہر ہوگیا۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ کلام اللہ کا نزول دو طرح کا ہے۔

(۱) یکبارگی نازل کرنے میں (۲) آیت کے نزول کا سبب اس کی تفسیر ہے۔

ایک نزول تو یہ ہے جس کو تدریجی کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس آیت شھر رمضان الــــذی میں یہ نزول مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ صرف رمضان یا لیلۃ القدر میں نہیں ہوا۔ بلکہ ۲۳ برس میں ہوا۔

عالم غیب کی وسعت

اور دوسرا وہ نزول ہے جو کہ دفعۃً ہوا اور اس آیت میں بھی مراد ہے اور یہ نزول اس عالم دنیا میں نہیں ہوا جس میں کہ نزول تدریجی ہوا ہے۔ بلکہ یہ نزول عالم غیب میں ہوا ہے یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور یہ دونوں اس عالم کے جز ہیں۔ اور اس کے ذی اجزاء ہونے کو بعید نہ سمجھا جائے اس میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ عالم دنیا اس سے وہ نسبت رکھتا ہے جو سوئی پر لگا ہوا ایک قطرہ سمندر سے رکھتا ہے یعنی یہ عالم دنیا اس کے سامنے مثل ایک قطرہ کے ہے اور وہ اس کے اعتبار سے مثل سمندر کے ہے۔

اہل کشف نے لکھا ہے کہ دونوں عالموں میں وہی نسبت ہے جو کہ رحم مادر اور عالم دنیا میں ہے بچہ اول رحم مادر میں رہتا ہے اور اس کے لئے وہ ایک عالم ہوتا ہے اور اس سے اس قدر مانوس ہوتا ہے اگر شاید وہاں سے اس کی رائے لے کر عالم دنیا میں لایا جائے تو وہ کبھی گوارا نہ کرے اور مچل جائے۔ لیکن اگر اس کو کسی طرح وہاں سے نکال لیا جائے جیسا کہ اس طرح لایا جاتا ہے اور عالم دنیا میں وہ یہاں کی رونق، چہل پہل یہاں کی آبادی اور معمورہ(۱) دنیا کو دیکھے تو عالم رحم اس کو بالکل ہیچ اور عدم معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح اہل دنیا جو کہ اس عالم میں محبوس اور اسیر ہیں۔ جنہوں نے آنکھ کھولنے کے وقت سے آنکھ بند کرنے تک اس کے سوا اور کسی عالم کو دیکھا ہی نہیں جب ان کو اس عالم کے چھوڑ دینے اور دوسرے عالم

(۱) دنیا کی وسعتوں۔

میں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں ان کا دل مضطرب (۱) ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس عالم کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے۔ ہاں وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عینا یا ذوقاً علم مکاشفہ دیا ہے (۲) اور وہ اس عالم کو مشاہدہ کر چکے ہیں تو ان کو اس کی جدائی کا نہ قلق ہوتا ہے (۳) نہ وہ اس سے گھبراتے ہیں بلکہ وہ اس عالم سے انتقال کے متمنی اور آرزومند رہتے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے لوگوں کے مقابلہ میں یہ لوگ زیادہ مقبول اور صاحب کمال ہیں۔ اس واسطے کہ ان کی فضیلت یا تو اشتیاق کی وجہ سے ہوسکتی ہے یا کشف کی وجہ سے، سو اشتیاق کی وجہ سے تو اس لئے یہ صاحب فضیلت نہیں کہ جب عالم غیب اور اس کے نعم ولذائذ کو دیکھ چکے ہیں پھر اس کی طرف رغبت کرنا اور اس کا مشتاق ہونا کیا کمال کی بات ہے خوشنما باغیچہ کو جو شخص بھی دیکھے گا اس کی سیر کا متمنی ہوگا۔

کشف اور بزرگی

اور کشف کی وجہ سے اس لئے صاحب فضیلت نہیں کہ کشف دلیل بزرگی اور مقبولیت کی نہیں۔ اس کی بناء محض مجاہدہ اور کثرت ریاضت پر ہے اکثر ہنود (۴) کو بھی ہونے لگتا ہے اور مرنے کے بعد تو سب ہی کو ہوگا۔ البتہ اہل کشف کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت ہے کہ دنیا میں رہ کر جو ذوق ان کو حاصل ہے دوسروں کو نہیں اور کشف کی حقیقت معلوم ہو جانے سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ بعض ناواقف لوگ جو کشف کے درپے ہوتے ہیں اور اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشف نہ ہونے کی صورت میں اگر عمل ہو تو وہ زیادہ کمال کی بات ہے۔ چنانچہ خداوند جل وعلا جائے مدح فرماتے ہیں۔

(۱) بیقرار (۲) جنھوں نے اس عالم کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر لیا یا ذوق سلیم سے سمجھ لیا (۳) افسوس (۴) ہندوں کو۔

الذین یومنون بالغیب ''جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں''

حدیث میں ہے کہ حضورﷺ نے صحابہ سے فرمایا ای الخلق اعجبھم ایمانا (۱) یعنی تمام خلق میں سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہ j نے عرض کیا الملائکۃ یا رسول اللہ !الخ، یعنی فرشتوں کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے آپﷺ نے فرمایا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوتی جب کہ ہر وقت کلام واحکام سے مشرف ہوتے ہیں۔ صحابہ j نے کہا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا۔ آپﷺ نے فرمایا بھلا وہ کیوں ایمان نہ لاتے۔ ہر وقت تو ان پر وحی نازل ہوتی ہے صحابہ j نے کہا کہ پھر ہمارا۔

آپﷺ نے فرمایا کہ تم کیوں ایمان نہ لاتے۔ ہر وقت مجھے دیکھتے ہو۔ مجھ سے سنتے ہو آخر صحابہ j نے عرض کیا کہ حضورﷺ پھر کون لوگ ہیں؟ آپﷺ نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے جنہوں نے نہ مجھ کو دیکھا ہوگا نہ نزول قرآن کی کیفیت دیکھی ہوگی۔ محض چند لکھے ہوئے کاغذ دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مکاشفہ کی نسبت عدم مکاشفہ (۲) کی حالت زیادہ افضل اور اسلم ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مطلقاً غیر مکاشفین مکاشفین سے افضل ہیں۔ اگر اہل کشف میں اور فضائل بھی ہوں جیسے انبیاء علیہم السلام تو وہ افضل ہوں گے اور اعجب ہونا دوسری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑتے وقت گھبراتے اور مضطرب ہوتے ہیں (۳)۔ جالینوس کے متعلق مشہور ہے

(۱) مشکوٰۃ المصابیح:۹:۷۶۲، مجمع الزوائد للہیثمی:۱۰/۶۵ بلفظ آخر (۲) کسی چیز کا حال معلوم ہونے کے بعد اس کا یقین کرنا اور بغیر حال معلوم ہوئے یقین کرنا یہ زیادہ افضل ہے (۳) جن کو پوشیدہ عالم کا حال معلوم نہیں وہ مرتے وقت گھبراتے ہیں۔

کہ جب مرنے لگا تو یہ تمنا کرتا تھا کہ میری قبر میں ایک سوراخ رہے کہ دنیا کی ہوا آتی رہے لیکن غیر مکاشفین اگر اہل ایمان کامل ہیں تو گو ان کو طبعًا اس عالم کو چھوڑنا گراں گزرے اور وہ موت سے گھبرائیں جیسا کہ حضرت عائشہ k فرماتی ہیں کلنا یکرہ الموت [۱]۔ مگر مرنے کے بعد جب اس عالم کی سیر کریں گے اور اس کو دیکھیں گے اور اس کی وسعت آنکھوں کے سامنے ہوگی تو ان کی وہی حالت ہوگی جو کہ رحم مادر سے نکل کر اور عالم دنیا دیکھ کر بچے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے اور عالم دنیا کے سامنے اپنے اس پہلے عالم کو ہیچ بلکہ لاشے [۲] محض سمجھنے لگتا ہے حکیم سنائی اسی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

آسمانہاست درولایت جاں	کار فرمائے آسماں جہاں
دررہ روح پست وبالاہست	کوہ ہائے بلند وصحرا ہست

''روح کے ملک میں بہت سے آسمان ہیں جو اس دنیا کے آسمانوں کو چلانے والے ہیں روح کے راستے میں گڑھے بھی ہیں اور ٹیلے بھی اور بہت سے اونچے پہاڑ اور جنگلات ہیں''

لیلۃ القدر

غرض! وہ عالم جب ذی اجزاء ہے [۳] اور یہ دفعی نزول اسی عالم کے ایک جز سے دوسرے جز میں ہوا ہے اور اسی کی نسبت کلام مجید میں ایک جگہ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [۴] ''رمضان المبارک وہ ہے جس میں قرآن حکیم نازل کیا

(۱) ہم سب میں سے ہر ایک طبعی طور پر موت کو نا پسند کرتا ہے (۲) بیکار محض (۳) بہت سے اجزا ہیں
(۴) سورۃ البقرۃ: ۱۸۵۔

گیا'' فرمایا اور دوسری جگہ ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ '' بے شک ہم نے اس کو شب قدر میں اتارا ہے'' فرمایا اور مراد دونوں مقام میں نزول دفعی ہے جیسا اوپر معلوم ہوا۔

تو ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے کیونکہ اگر لیلۃ القدر غیر رمضان میں ہو تو کلام مجید کی آیتوں میں تعارض لازم آئے گا کہ ایک آیت سے دفعی نزول رمضان میں اور ایک جگہ غیر مضان میں ثابت ہوگا جو کہ محال ہے اور حدیثوں سے بھی شب قدر کا عشرہ اخیرہ میں ہونا معلوم ہوتا ہے پس جب شب قدر میں نزول ہوا تو عشرہ اخیرہ میں نزول ثابت ہوگیا۔ اور یہی مناسبت ہے۔ اس آیت کو عشرہ اخیرہ کے ساتھ اور رمضان کی فضیلت کے ساتھ عشرہ اخیرہ کی فضیلت بھی اس آیت سے ثابت ہوگئی اور فضیلت بھی بہت بڑی کہ اس میں قرآن کا نزول ہوا ہے کیونکہ قرآن مجید ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے جس زمانہ میں وہ نازل ہوگا وہ زمانہ بھی ضرور مبارک اور مشرف ہوگا اور اس فضیلت کی قدر کوئی عشاق کے دل سے پوچھے کہ جس زمانہ میں ان کو محبوب کے خط کی زیارت ہوتی ہے وہ زمانہ ان کے نزدیک کس قدر معزز و مشرف ہوتا ہے۔ قرآن شریف بھی کلام خداوندی ہے اور خدا تعالیٰ محبوب حقیقی ہیں۔ پس وہ زمانہ کہ جس میں محبوب حقیقی کا کلام نازل ہو۔ کیوں مبارک اور مشرف نہ ہوگا۔ مظروف کے ظرف سے ظرف کو بھی ضرور شرف ہوا کرتا ہے چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

گفت معشوقے بعاشق کائے فتا　　　تو بغربت دیدہ بس شہر ہا
پس کدامی شہر از انہا خوشترست　　　گفت آں شہرے کہ دروے دلبرست

''ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا تو نے اپنے سفر میں بہت سے شہر دیکھے تو ان میں سے کون سا شہر بہتر ہے۔ عاشق نے جواب دیا کہ وہی شہر سب

سے بہتر ہے جس میں معشوق موجود ہے''

دیکھو اگر کسی عاشق کو کنوئیں کے اندر وصال حبیب ہو تو وہ اس کنویں کو چمن سے بھی کم نہ سمجھے گا اس کے دل میں اس کنویں کی عظمت ایک پھول سے بھرے چمن سے بھی زیادہ ہوگی اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس زمانہ کو بھی شرف ہے اکثر وہ کسی مظروف(۱) ہی کے شرف کی وجہ سے ہے۔

جمعہ کی فضیلت

یہی وجہ ہے کہ جمعہ کا دن اور ایام(۲) سے افضل ہے کیوں کہ اس دن میں ایک ایسا مظروف موجود ہے جو کہ دوسرے ایام میں نہیں اکثر لوگ جمعہ کی فضیلت پر اعتراض کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کیا وجہ جمعرات کو وہ فضیلت کیوں حاصل نہیں جو جمعہ کو حاصل ہے۔ وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں۔ وہی ایک دن جمعرات میں ہے وہی ایک دن جمعہ میں ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض بالکل ہی لغو ہے(۳) کیونکہ اشتراک فی الساعات(۴) اور تشابہ فی الظاہر سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو ایک کی حالت ہو وہی دوسرے کی بھی ہو۔ کیا اگر کسی شخص کی بہن اور بیوی بالکل ہم شکل ہوں اور سامان زینت میں بھی دونوں برابر ہوں تو کیا ان میں حلال وحرام کے فرق ہونے کو خلاف عقل کہا جائے گا اور کیا یہ شخص دونوں سے برابر برتاؤ کریگا اور کیا اس شخص کے دل میں دونوں کی محبت ایک قسم کی ہوگی اور جو علاقہ کشش بیوی کے ساتھ ہے وہ بہن کے یا ماں کے ساتھ بھی ہوجائیگا۔ یہ ضرور ہے کہ محبت ماں اور بہن سے ہوگی لیکن کیا دونوں محبتوں میں فرق

(۱) زمانے کو فضیلت اس میں ہونے والے کام سے ہی ہوتی ہے (۲) دنوں سے (۳) بیکار (۴) گھنٹوں کے برابر ہونے اور ظاہری مشابہت۔

عظیم نہ ہوگا ضرور ہوگا۔ بہن اور ماں بھی محبوب ہیں اور بیوی بھی محبوب ہے لیکن دونوں کی محبت الگ الگ ہے کبھی کسی شخص کو نہیں دیکھا گیا کہ وہ بیوی کی طرح ماں کو بھی پیار کرے یا اس کو بغل میں لینے کی خواہش کرتا ہو۔ بلکہ طبعًا اس قسم کے خیالات سے اس قدر نفرت ہوتی ہے کہ اگر خواب میں اپنی ماں کے ساتھ صحبت کرتے دیکھ لیتا ہے تو بیدار ہوکر بے حد پریشان ہوتا ہے اور اپنے کو لعنت ملامت کرتا ہے حالانکہ تعبیر اس خواب کی بری نہیں۔

تعبیر یہ ہے کہ ایسا شخص متواضع اور منکسر المزاج ہوگا کیونکہ خواب میں معانی اپنے مناسب صورتیں اختیار کرتے اور اس میں متمثل ہوتے ہیں (۱) اس قسم کے خواب میں ماں سے مراد زمین ہوتی ہے باعتبار اپنی صفت خاکساری (۲) اور صحبت سے مراد تلبس (۳)۔ پس یہ اشارہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو صفت خاکساری سے تلبس اور تعلق ہوگا۔ ایک بزرگ سے کسی نے یہی خواب بیان کیا انہوں نے یہی تعبیر دی۔ اگر کسی جاہل سے ایسا خواب بیان کیا جائے معلوم نہیں کیا تعبیر دے۔

اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہوتا ہے لا تحدث الا لبیا او حبیبا (۴) یعنی جاہل آدمی سے اپنا خواب بیان نہ کرو۔ بلکہ کسی عقل مند یا دوست سے بیان کرو کیونکہ عقل مند تم کو واقعی تعبیر سمجھ کر بتلا دے گا۔ اور تمہارا دوست اگر نہ بھی جانتا ہوگا تو خاموش ہو رہے گا گڑ بڑ نہ بتلائے گا۔ بخلاف اجنبی بے وقوف یا دشمن کے کہ وہ خدا جانے کیا بتلا دے۔

---

(۱) اس شکل میں ظاہر ہوتے ہیں (۲) صفت تواضع (۳) تعلق (۴) لم اجد الحدیث فی موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف۔

محبتوں میں فرق

مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک بار یہ مقولہ نقل فرمایا۔

تا آنکہ مادر خوب جفت نہ شود　　وبردار خودرا نہ کشد عارف نہ شود

''جب تک اپنی ماں سے جفتی نہ ہو اور چھوٹا بھائی پیدا نہ ہو اس وقت تک عارف نہیں ہوتا''

کسی نے کہا کہ حضرت جز اول (۱) تو میں نے بھی دیکھا ہے دوسرا جز البتہ نہیں دیکھا۔ فرمایا بس اتنی ہی تو کسر ہے مراد جز ثانی سے نفس کا مغلوب ہوجانا ہے۔ پس باوجود اس کے کہ اس قسم کے خواب کی تعبیر ایسی حسن ہے (۲) لیکن اگر کوئی ایسا خواب دیکھتا ہے تو بہت پریشان اور تنگدل ہوتا ہے اور بیداری میں تو کیا پوچھنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری نوع کی ہے (۳) اور بیوی کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری قسم کی ہے دونوں محبتیں یکساں نہیں۔ اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ احادیث محبت میں جو بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے حضرت عائشہ k کا سب سے زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ دوسری سے حضرت ابوبکر h کا۔ تیسری سے حضرت فاطمہ k کا واقع میں ان میں تعارض اور اختلاف کچھ نہیں۔ سب حدیثیں مختلف درجات محبت کے اعتبار سے صحیح ہیں کیونکہ جس حدیث سے حضرت عائشہ k کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ازواج مطہرات میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور جس حدیث سے حضرت ابوبکر صدیق h کا زیادہ محبوب ہونا معلوم

(۱) پہلے جزء کے نہ ہونے یعنی تواضع کے نہ ہونے کا نقصان تو ہوئے بھی دیکھا ہے (۲) اچھی (۳) قسم کی۔

ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اصحاب واحباب میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔

الغرض! اشتراک فی الساعات من کل الوجہ کو موجب نہیں ہے (۱) بلکہ ممکن ہے کہ ایک میں دوسرے پر فضیلت بالذات (۲) ہو بالخصوص (۳) جب کہ ازدیاد برکت (۴) کی کوئی دوسری وجہ بھی موجود ہو جو حاصل ہے فضیلت لغیرہ (۵) کا۔ جیسا ہم نے بیان کیا کہ ظرف کا شرف مظروف کے شرف (۶) سے ہوتا ہے اور اس کی تفصیل یوں سمجھنی چاہیے کہ وہ مظروف جس کی وجہ سے ظرف کو شرف ہوا ہے یا تو خداوند جل وعلا کا کوئی فعل ہوگا یا بندے کا کوئی فعل ہوگا پس اگر خدا تعالیٰ کا فعل ہے تو چونکہ افعال خداوندی میں بعض نافع ہیں اور بعض انفع (۷)۔ اس لئے اس تفاوت کی وجہ سے ان ازمنہ میں بھی تفاوت (۸) ہوگا۔ جن میں یہ افعال پائے جائیں۔ مثلاً توریت کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے اور وہ بھی نافع ہے اور قرآن کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے مگر یہ بوجہ انفعیت قرآن کے انفع ہے (۹) پس زمانہ نزول تورات اور زمانہ نزول قرآن میں اسی درجہ کا تفاوت ہوگا جو کہ تنزیل قرآن اور تنزیل تورات (۱۰) میں ہے۔ اور اگر وہ فعل بندہ کا ہے تو اس میں بھی یہی حالت ہے کیونکہ فعل عبد یا عبادت ہے یا معصیت ہے اور ہر ایک میں نافع وانفع وضار مضر موجود ہیں (۱۱)۔ پس جس طرح کا فعل جس زمانہ میں ہوگا۔ اسی طرح کی صفت

(۱) گھنٹوں میں برابری ہونے سے ہر اعتبار سے برابر ہونا لازم نہیں آتا (۲) ذاتی فضیلت ہو (۳) خاص طور پر (۴) برکت کی زیادتی کی (۵) بوجہ غیر کے فضیلت ہونا (۶) کبھی برتن کو اس میں موجود چیز کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے (۷) بعض مفید اور بعض زیادہ مفید (۸) اس فرق کی وجہ سے ان زمانوں میں فرق ہوگا (۹) قرآن کے نفع کے زیادہ ہونے کی بنا پر یہ زیادہ مفید ہے (۱۰) قرآن کے نازل ہونے اور توریت کے نازل ہونے میں (۱۱) ہر ایک میں مفید اور زیادہ مفید یا نقصان دہ اور زیادہ نقصان دہ موجود ہیں۔

زمانہ کے لئے ثابت ہوگی۔ اگر کسی نافع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اس قسم کی برکت آئے اور کسی انفع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اس قسم کی برکت حاصل ہوگی۔

علیٰ ہذا اگر کسی خفیف گناہ کا صدور ہوا تو زمانہ صدور اس کے لئے برا زمانہ ہے۔

اور اگر کسی بڑی معصیت کا صدور ہوا تو زمانہ صدور اس کے لئے بہت برا زمانہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ آثار کا تفاوت اول اعمال کے لئے ثابت ہوتا ہے اس کے بعد اور اس کے واسطے سے زمانہ کے لئے۔ پس چونکہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا اور وہ مشرف و معظم ہے۔ اس کے شرف کی وجہ سے زمانہ نزول یعنی رمضان بھی ضرور مشرف ہوگا۔

تلاوت کی اہمیت

صاحبو! کیا مجازی محبوب کی گفتگو اور خط ملنے کا وقت تو پیارا اور عزیز ہو اور محبوب حقیقی کے کلام نازل ہونے کا وقت مشرف وممتاز نہ ہو قطع نظر اس کے کہ خدا کا کلام ہے اور اس کو انتساب ایک ذات عظیم کے ساتھ ہے۔

یہ بھی دیکھو کہ اس آفتاب کے نور نے تمہارے قلوب کو کیا روشنی بخشی ہے اور تم کو کس ضغطہ (۱) کی حالت سے نکالا ہے تمہارے اعتبار سے کیا نافع ہوا ہے ورنہ اگر اس کلام الٰہی کو صرف حق تعالیٰ سے ہی تعلق رہتا۔ تم سے تعلق نہ ہوتا تو تم اس سے کیسے مستفید ہوتے۔ غور کرو اگر آفتاب دنیا چند روز تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوجائے اور تم اس زمانہ میں بیمار بھی ہو۔ یا مثلاً ایک ماہ تک لگاتار بارش رہے اور گھڑی بھر کو بادل نہ ہٹے تو تمہاری کیا حالت ہوگی۔

(۱)__________

آخر یہ اس قدر پریشانی کیوں ہے محض اس وجہ سے کہ خدا نے تم کو ایک نور دیا تھا جو برائے چندے تم سے لے لیا گیا ہے۔ اور پھر خدا کا فضل دیکھو کہ نور بھی کس چیز سے دیا جو کہ تم سے لاکھوں کوس دور (۱) مگر اس کی شعاعیں ہیں کہ تم کو منور کر رہی ہیں اور تم طرح طرح کے فائدے اس سے حاصل کر رہے ہو۔ اور اگر شعاعیں نہ ہوتیں تو گو نور آفتاب کے ساتھ پھر بھی تعلق ہوتا۔ مگر چونکہ تم تک نہ پہنچتا۔ اس لئے تم اس کے فیض سے محروم رہتے۔ اسی طرح کلام اللہ صفت قدیم ہے کہ وہ مثل آفتاب کے ہے اور اس کے لئے کچھ شعاعیں ہیں جو تم پر فائض ہو رہی ہیں جن کو کلام لفظی کہا جاتا ہے۔

بغیر سمجھے قرآن پڑھنے کا فائدہ

صاحبو! اگر آفتاب ہوتا اور یہ شعاعیں نہ ہوتیں تو ہم اس کے فیض سے کس طرح فیضیاب ہوتے۔ علیٰ ہذا کلام نفسی کے لئے کلام لفظی کی شعاعیں نہ ہوتیں تو اس صفت کے فیضان سے کس طرح فیض حاصل کرتے اور چونکہ کلام اللہ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کلام مجید کی تلاوت سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ خواہ سمجھ کر پڑھا جائے یا بے سمجھے پڑھا جائے برخلاف دوسرے اعمال لسانیہ (۲) مثل دعا و ذکر کے کہ اگر ان کو بے سمجھے کرو تو اس درجہ معتد بہ محبوب نہیں مگر قرآن ہر طرح مقبول ہے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل m کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا قرأت قرآن یعنی قرآن پڑھنا۔ امام صاحب نے عرض کیا بفہم او بلا فہم یعنی سمجھ

(۱) لاکھوں میل (۲) زبان کے دوسرے عملوں کے۔

کر یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا بفھم او بلافھم یعنی کسی طرح ہو۔

اور کچھ مدار اس کا خواب ہی پر نہیں بلکہ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حروف صرف الفاظ ہیں۔ ان کی تلاوت بلافہم پر بھی تلاوت صادق آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بلافہم بھی قبول تام ہے گو بفہم پر اتم ہوتا ہے۔(۱)

اس تقریر سے آج کل کے روشن خیالوں کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی ہوگی۔ اکثر حضرات یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب کلام اللہ کو سمجھا نہیں جاتا تو اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ سو! ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کلام مجید کا بے سمجھے پڑھنا بھی پورا فائدہ رکھتا ہے کیونکہ تلاوت قرآن میں صرف ایک یہی فائدہ نہیں کہ ہم اس کے معنی کو سمجھیں بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہم سے خدا تعالیٰ راضی ہوں جیسا بیان ہوا۔

حال وقال کا فرق

یہ بات عقل اور عادت کے موافق بھی ہے۔ دیکھو قاعدہ ہے کہ اگر مصنف کسی کو اپنی کوئی کتاب پڑھتے دیکھے تو اگر چہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص بے سمجھے پڑھ رہا ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے کلام پر توجہ کی اور اس کی قدر کی۔ مصنف کو پڑھنے والے سے ضرور محبت ہو جائے گی اور دل میں اس کی قدر ہوگی۔

حضرت مرشدنا حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک بار دہلی بازار میں جاتا تھا۔ ایک دکان پر ایک مجمع دیکھا کہ اسکے درمیان میں ایک شخص

(۱) بغیر سمجھے پڑھنا بھی مقبول ہے اگر چہ سمجھ کر پڑھنا زیادہ مقبول ہے۔

رسالہ دردنامہ غمناک نہایت شوق سے پڑھ رہا تھا۔ کوئی عاشق مزاج معلوم ہوتا تھا۔ حضرت صاحب m بھی اس مجمع میں کھڑے سن رہے تھے اور طبعاً خوش ہورہے تھے کہ میرا کلام پڑھ رہا ہے اس شخص کو گو خبر نہ تھی مگر مصنف پاس تھے اور خوش تھے۔

اسی طرح ایک بار پانی پت تشریف لے جاتے تھے۔ راہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ یہ رسالہ پڑھتا جاتا تھا۔ اور یہ رسالہ دردنامہ غمناک اگرچہ شاعری کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کا رسالہ نہیں ہے لیکن چونکہ دردِ دل سے نکلا ہے اس لئے نہایت اثر رکھتا ہے واقعی از دل خیزد بردل ریزد۔ غالب کے زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ آشفتہ کے اس شعر پر ؎

حال آشفتہ چہ دانی بے خبر　　درخیال زلف عنبر بوئے تو

’’بے خبر شخص آشفتہ کے حال کو کیا جان سکتا ہے وہ عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں مست ہے‘‘

آشفتہ کے استاد نے جب یہ اصلاح دی۔

حال آشفتہ پریشان تر شدہ　　درخیال زلف عنبر بوئے تو

’’تیری عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں پریشان شخص کی حالت اور بہت زیادہ پریشان ہوگئی ہے‘‘

غالب کو دونوں شعر پہنچے تو سن کر کہنے لگا کہ استاد صاحب قال ہے اور شاگرد صاحب حال ہے۔ واقعی جب دل سے کوئی کلام نکلتا ہے اور دل میں درد ہوتا ہے تو پھس پھسا کلام بھی وہ مزا دے جاتا ہے کہ ہزار چست بندشیں وہ مزا نہیں دیتیں۔ مولانا روم اپنے اس شعر میں اسی درد دل اور استغراق کو ظاہر فرما کر قافیہ

وغیرہ پر اعتراض کرنے والوں سے عذر فرما رہے ہیں ۔

قافیہ اندیشم ودل دار من　　گویدم مندیش جز دیدار من

’’میں شعر کے لئے قافیہ سوچنے لگتا ہوں تو میرا معشوق مجھ سے کہتا ہے کہ تو سوائے میرے دیدار کے کسی اور چیز کی طرف خیال مت کر‘‘

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مجھ سے کسی مقام پر شاعرانہ فروگذاشت ہوگئی تو وہ قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ نکات پر نظر رکھنا توجہ الی الشعر پر موقوف ہے اور یہاں دیدار یار سے اتنی فرصت کہاں کہ ان فضول دھندوں میں وقت ضائع کریں۔

نسبت انعکاسی

صاحبو! اس تقریر میں غور کرو گے تو معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو ملکہ شاعری نہ دینے کی ایک یہ بھی وجہ تھی ۔ بھلا غیرت خداوندی کیوں کر جائز رکھتے کہ ان کا محبوب ومحبّ اس کی طرف سے التفات ہٹا کر دوسری چیز پر ملتفت ہو۔

توجہ متعارف کے نقصانات

یہی بھید ہے کہ اکثر محققین صوفیا نے مریدوں پر متعارف توجہ دینے کے طریق کو بالکل ترک فرمادیا۔ وجہ یہی ہے کہ اس طریق توجہ میں مریدوں کے اندر کسی کیفیت کے القاء کے لئے اس قدر استغراق کرنا شرط تصرف ہے کہ بجز اس مقید القاء کے کسی طرف التفات نہ ہو اور تمام تر خیالات سے بالکل خالی ہوجائے۔ حتی کہ واقعی اس وقت حق تعالیٰ کی طرف بھی توجہ کم ہوجاتی ہے۔ سو اس قدر توجہ مستغرق خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ ان کو غیرت آتی ہے اور ان پر سخت گراں گزرتا ہے کہ یہ شخص خدا سے بالکل غائب ہوجائے۔

فرمایا کہ ایک ضرر شیخ کو توجہ متعارف میں یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصرفات دیکھ کر چند روز میں عجب پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ اس متعارف طریق توجہ سے شہرت ہو جاتی ہے۔ اور جس شہرت کے اسباب مقدور الترک ہوں وہ اکثر مضر ہوتی ہے۔ (۱)

تیسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ شیخ اگر ضعیف القویٰ ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے۔ یہ تین ضرر شیخ کو ہوتے ہیں اور مرید کو یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ شیخ پر اتکال کر لیتا ہے (۲) اور خود کچھ نہیں کرتا۔ اس لئے اس کی نسبت محض انعکاسی ہوتی ہے (۳) اکتسابی نہیں ہوتی (۴) اور نسبت انعکاسی کو قیام نہیں ہوتا (۵)۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ توجہ تو خود حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت جبرئیل d کی نسبت حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ غطنی فبلغ منی الجھد سو اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس غط کو توجہ کہنا محض بے دلیل ہے اس کا حاصل صرف الصاق بالصدر مع شدت ہے (۶) نہ کہ توجہ متعارف اور اگر تسلیم بھی کیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت جبرائیل d کو بوجہ قوت ملکی توجہ میں اس قدر استغراق کی ضرورت نہ ہوئی ہو جو توجہ الی الحق کو مانع ہو۔ وذاك لا یضر ''اور یہ مضر نہیں''

اگر کہا جائے کہ ممکن ہے کہ منفعل کی تفاوت استعداد (۷) سے کسی وقت کمال استغراق کی ضرورت نہ ہو۔ تو جواب یہ ہے کہ فاعل کو ہر صورت میں کمال

(۱) جس شہرت کے اسباب کو ترک کرنے پر آدمی قادر ہو عام طور سے ایسی شہرت نقصان دہ ہوتی ہے (۲) وہ شیخ پر بھروسہ کر کے بیٹھ جاتا ہے (۳) اسکی نسبت صرف ایک عکس کا درجہ رکھتی ہے (۴) اسکی حاصل کردہ نہیں ہوتی (۵) انعکاسی نسبت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی (۶) سینے سے زور سے چپٹا لینا ہے (۷) جس پر توجہ ڈالی جارہی ہے اس کی استعداد اتنی کامل ہو کہ اس میں استغراق کی ضرورت نہ پیش آئے۔

استغراق کی ضرورت ہوگی البتہ تفاوت استعداد سے منفعل میں فرق ہوگا کہ تام الاستعداد بسہولت اور جلد متاثر ہوگا اور ناقص الاستعداد بدیر متاثر ہوگا۔

فیض رسانی کی صورتیں

ہاں دو صورتیں فیض رسانی کی اور ہیں۔ ایک تو ان کے اختیار سے بھی خارج ہے وہ یہ کہ ان کی ذات بابرکات کے فیوض برکات سے کہ ان کو اس طرف التفات بھی نہیں عالم مستفیض ہوتا ہے جس طرح بارش کہ اس کے برسنے پر قابل حصہ زمین میں قوت نمو پیدا ہو ہی جاتی ہے خواہ بارش چاہے یا نہ چاہے۔ یا آفتاب کہ اس کے طلوع کے وقت جو چیز اس کے مقابل ہوگی ضرور منور ہوگی دوسری اختیاری ہے جیسے مریدین کے لئے دعا کرنا ان کی حال کی نگرانی کرنا شفقت سے نصیحت کرنا اس کو بھی توجہ بالمعنی اللغوی کہا جاتا ہے(۱) مگر اصطلاحی توجہ بمعنی تصرف نہیں۔ سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ مسنون ہے کیونکہ طریق توجہ کے ترک کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں ذات باری تعالیٰ سے غیبت ہے اور چونکہ اس دوسرے طریق میں ترک التفات الی اللہ نہیں۔ بلکہ زیادت التفات الی اللہ ہے اس لئے یہ مذموم (۲) نہیں بلکہ مطلوب ہے اور گو اس وقت توجہ الی الخلق بھی ہوتی ہے مگر وہ توجہ صارف عن التوجہ الی الخلق نہیں ہے(۳)۔ بلکہ دعا کی تو حقیقت ہی توجہ الی الخالق ہے گو لنفع سہی اور یہ نفع بھی خاص مرضی حق ہے اور نگرانی و نصیحت و تعلم وغیرہ میں بھی اعتدال توجہ الی الخلق غیر مانع عن الحق ہے اور وہ بھی باذن الخالق ہی تو ہے انہماک فی الخلق وغیب عن الحق نہیں ہے۔

---

(۱) لغوی معنی کے اعتبار سے اس کو بھی توجہ کہتے ہیں (۲) ناپسندیدہ (۳) اللہ کی طرف توجہ کو ہٹانے والی نہیں ہے۔

توجہ کی اقسام

حاصل یہ ہے کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جس میں خدا تعالیٰ سے غیبت ہے(۱) دوسرے وہ کہ اس میں احداث التفات الی الخلق ہو(۲)۔ پہلی قسم کملا کے (۳) ہاں متروک ہے دوسری قسم مطلوب ومحمود ہے۔ البتہ پہلی قسم کی توجہ سے اگر اپنے تصرف اور بزرگی کا اظہار مقصود نہ ہو بلکہ محض افادہ خلق مقصود ہو تو وہ جائز ضرور ہے۔ گو کملاء نے اس کو ایک باریک وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور اگر اس سے اپنے تصرف کا اظہار یا زیادت جاہ مقصود ہو تو مذموم ہے (۴)۔ پس اس کا وہی مرتبہ ہے جو غلام پہلوان اور نجیت سنگھ کی کشتی کا۔ جس درجہ میں یہ کشتی محمود ومذموم ہے بالکل اسی درجے میں یہ توجہ بھی ہے۔

حقیقت توجہ

خلاصہ یہ ہوا کہ توجہ مروج فی نفسہٖ کوئی مطلوب ومحبوب چیز نہیں ہے لیکن اگر اس کی غایت محمود ہو تو اس میں بالعرض مطلوبیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح ورزش! کہ اگر اس سے غرض محض اظہار قوت وصولت ہے تو لغو ہے اور اگر اعانت مخلوق اس کی غرض ہے تو محمود ہے پس یہ توجہ ایک مرتبہ میں تو طاعت ہے لیکن اس سے زیادہ درجہ میں وہ توجہ ہے جو کہ انبیاء اپنے اصحاب اور امت پر فرماتے تھے۔ یہی انبیاء کا طریق توجہ ہے جس کو کاملین نے اختیار کیا ہے کہ اس میں وہ خطرہ نہیں ہے جو کہ مروج طریق میں ہے اور وہ توجہ ہے خلق کی طرف جو کہ سالک کے لئے نہایت مضر ہے۔ حتیٰ کہ ابتداء میں مطلق افادہ کے ارادہ سے بھی توجہ کرنا مضر ہوا ہے۔

---

(۱) دوری (۲) مخلوق کی طرف التفات کا پیدا کرنا (۳) کاملین (۴) ناپسندیدہ۔

منصب ہدایت

ایک بزرگ کی حکایت مشہور ہے کہ اپنے ایک مرید کو مدت تک ذکر و شغل بتلاتے رہے اور اس میں تغیر و تبدل بھی کرتے رہے لیکن مرید کو کچھ نفع نہ ہوا۔ آخر مدت کے بعد اس سے یہ پوچھا کہ تم یہ ذکر و شغل کس نیت سے کرتے ہو اس نے کہا کہ حضرت یہی نیت ہے اگر کسی قابل ہو جاؤں گا تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے کہا توبہ کرو یہ شرک ہے کہ ابھی سے بڑے بننے کا خیال ہے اور خلق مقصود بالنظر ہے[1]۔ جب اس نے اس خیال سے توبہ کی فوراً فائدہ محسوس ہوا۔ گویا افادہ کی غرض سے بھی جو کہ بظاہر محمود ہے خلق کی طرف توجہ کرنا ابتداء سلوک میں مضر ہوتا ہے۔

اس حکایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ کامل کبھی مایوس نہیں ہوتا نہ مرید کو مایوس کرتا ہے۔ جیسا یہ شیخ مدت تک تغیر اور تبدل کرتے رہے اور نفع نہ ہونے سے جواب نہیں دیا۔ بلکہ اسی کاوش میں رہے حتی کہ مرض اور اس کا علاج نکال ہی لیا۔ وہ طبیب حاذق کی طرح کسی نہ کسی نئی ادھیڑ بن میں برابر لگا ہی رہتا ہے برخلاف ظاہری اور ناقص پیروں کے وہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں اور دوسرے کو بھی مایوس کر دیتے ہیں اسی پر حافظ شیرازی m فرماتے ہیں ۔

بندہ پیر خرا باتم کہ لطفش دائم ست   زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

''میں میکدہ کے مالک کا غلام ہوں کہ اسکی ہمیشہ مہربانی رہتی ہے جبکہ ناقص شیخ اور پابندی شریعت زاہد خشک کی مہربانی کبھی کبھی رہتی ہے''

مصرع ثانی میں شیخ سے مراد شیخ ناقص ہے بلکہ اگر کشف سے بھی کسی کی شقاوت[2] ظاہر ہو جائے تب بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ دعا تبدل بالسعادت[3]

(۱) مخلوق پر نظر ہے (۲) بدبختی (۳) نیک بختی میں تبدیلی کی دعاء کرتے ہیں۔

کی کرتے ہیں۔ البتہ اگر کسی نبی کو وحی سے کسی کا ختم علی الکفر [۱] معلوم ہو جائے تو اس وقت مایوس ہونا وہ خدا ہی کے حکم سے ہے۔

نیز اسی حکایت سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ ہر شخص منصب ہدایت کی لیاقت نہیں رکھتا۔ بہت سے نام کے ایسے ہادی ہیں کہ جن کی غرض ہدایت سے محض طلب جاہ ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے: لا یقص الا امیر او مامور او مختال [۲]

یعنی وعظ کہنے کی ہمت وہی کریگا کہ یا تو خود امیر المومنین ہے یا امیر المومنین کی طرف سے مامور ہے یا متکبر اور نفس پرور ہے۔

اس لئے کہ جب ہدایت عامہ کا کام امیر المومنین کی ذمہ داری میں ہے تو اس کو وہ خود کریگا یا خود نہ کریگا تو کسی کو اس خدمت پر مامور کریگا۔ پس جو شخص نہ یہ ہے نہ وہ ہے اور پھر بھی ایسا کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ بھی خواہ مخواہ اپنے کو پانچوں سواروں میں گنتے ہیں۔

شبہ کا جواب

لیکن اس سے یہ شبہ کیا جائے کہ جب بغیر امیر یا مامور ہوئے وعظ کہنا مختال [۳] ہونے کی علامت ہے تو آج کل کے تمام وعاظ [۴] میں سے تو ایک شخص بھی امیر یا مامور نہیں تو یہ کیا یہ سب کے سب تیسری شق میں داخل ہیں۔

جواب یہ ہے کہ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس جگہ حاکم نہ ہو وہاں اگر متقی پرہیزگار اہل الرائے مسلمان حاشیہ کسی ایک شخص کو کوئی منصب دیدیں تو وہ سب

(۱) کفر پر خاتمہ کا علم ہوجائے (۲) مسند احمد ۲: ۱۸۳، ۴: ۲۳۳، ۶: ۲۳، ۲۷، ۲۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۴۰، ۲۴۱ کنز العمال: ۱۵۰۲۹ (۳) متکبر ہونے کی علامت ہے (۴) واعظین۔

مل کر امیر کے قائم مقام سمجھے جائیں گے اور ان کا اعطا امیر ہی کا اعطا ہوگا کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اعطاء مناصب کا اختیار جو امام کو ہے وہ بھی درحقیقت اہل اسلام ہی کو ہے اور امام بحیثیت ان کا نائب ہونے کے ان کا کام کرتا ہے کیونکہ امام کا امام ہونا تو خود اہل اسلام کے اتفاق پر ہے پس اگر وہ موجود نہ ہو تو خود ان کا فعل جائز ضرور ہوگا۔

جیسے جمعہ کی نماز کے لئے انتخاب امام کا کہ اگر امیر موجود نہ ہو اور مسلمان مل کر کسی کو منتخب کرلیں تو وہ امام صحیح ہو جاتا ہے یا ناظر وقف کو امام کی عدم موجودگی میں اہل اسلام کے انتخاب سے کسی خاص شخص کو عہدہ نظارت وقف (۱) دیا جاسکتا ہے۔ پس جب دیندار فہیم مسلمانوں نے مل کر ایک شخص کو وعظ و نصیحت کے لئے انتخاب کرلیا ہو خواہ قولاً حالاً تو ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز ہے۔ باقی بدوں اہل دیں اور اہل عقل کے انتخاب کے جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں اور اہل نہیں ہیں تو وہ وعظ کے رنگ میں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ ضروری مسائل تک سے ان کو واقفیت نہیں ہوتی اور وعظ کہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔

جاہل واعظین

سہارنپور میں ایک جاہل دیہاتی نے آکر وعظ کہا۔ انداز یہ کہ آپ نے قبل از نماز پوچھا کہ یہاں آواج (وعظ) تو نہیں ہوتی معلوم ہوا کہ نہیں۔ پس نماز کے بعد پکار مارا کہ ساہبو! (صاحبو) آواج ہوگی۔ سنتیں پڑھ کر وعظ کہنے بیٹھے۔ اعوذ باللہ غلط سلط پڑھ کر یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ آیتیں الٹی سیدھی پڑھ کر ترجمہ شروع کیا۔ خوبصورت ہو اے محمد! اے محمد! اگر تجھ کو پیدا نہ کرتا نہ

(۱) وقف کی نگرانی کا عہدہ۔

زمین پیدا کرتا نہ آسمان نہ عرش نہ کرسی وغیرہ وغیرہ۔ پھر فرماتے ہیں بھائیو! تھکے ماندہ ہیں۔ اس واسطے آدھی آواج اب ہوئی آدھی پھر ہوگی۔ کوئی نابینا ذی علم اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے واعظ صاحب کو اپنے پاس بلا کر بٹھلایا اور پوچھا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے؟ فرماتے ہیں کہ ہماری تثیل (تحصیل) ہے ہاپڑ۔ بس ایسے واعظ رہ گئے ہیں۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ گولغو ہیں اور اپنی اور دوسروں کی تضییع اوقات (۱) کرتے ہیں مگر پھر بھی ان بیچاروں سے اس قدر نقصان نہیں ہوتا اور اتنی گمراہی نہیں پھیلتی جتنی وہ لوگ پھیلاتے ہیں کہ آب و تاب کی تقریریں مشق کیے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ یاد ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاحات ازبر ہیں۔ حافظ دیوان پیش نظر ہے۔ زبان ہے کہ آب رواں کی طرح بہتی چلی جاتی ہے لیکن واقفیت اور حقیقت دیکھو تو محض ہیچ! یہی لوگ ہیں کہ ان سے امت کے اکثر افراد تباہ ہوئے اور ہو رہے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

حرف درویشاں بدزدو مردوں تابہ پیش جاہلاں خواہد فزوں

’’درویشوں کی باتیں چوروں اور کمینہ ٹولیوں کے سامنے ایسی ہے جیسے جاہلوں کے سامنے عملیات کا پڑھنا‘‘

اہلیت ارشاد

یہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں او مختال کے لفظ سے یاد فرمایا گیا ہے۔ غرض اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ وعظ طاعت ہے۔ لیکن اگر اس میں نیت خراب ہو تو وہی گناہ ہو جاتا ہے صوفیاء نے اسی راز کو سمجھ کر ابتداء سلوک

(۱) اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔

میں وعظ گوئی سے بالکل منع فرمایا ہے کہ قبل اصلاح نفس اس میں اغراض فاسدہ غالب ہوتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ہر شخص اہلیت ارشاد کی نہیں رکھتا۔ سو شیخ ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

دیکھو! محقق شیخ کی وہ شان ہوا کرتی ہے جو اوپر کی حکایت میں مذکور ہوئی کہ کس دقیق مرض (۱) کو مرید کے سمجھ لیا جس کی نیت ذکر و شغل سے بڑا بننا اور خلق کو مطمح منظر بنانا تھا۔ پس اس طرح توجہ اگرچہ طاعت ہو لیکن وہ کاملین کے لئے طاعت نہیں۔ کیونکہ اس میں مخلوق کی طرف کامل توجہ لازمی اور ان کے حق میں غیر اللہ کی طرف التفات کرنا سخت گناہ ہے ؎

بہرچہ ازدوست دامائی چہ کفرآں حرف چہ ایمان
بہرچہ ازیار دورافتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

''جب تجھ کو دوست سے دور رہنا ہے تو پھر کفر و ایمان برابر ہے جب یار سے دور پڑا پھر چاہے اچھا نقشہ ہو یا برا''۔

تصور شیخ

خلاصہ یہ کہ نقش توجہ اگرچہ زیبا ہو (۲) لیکن جب کہ اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً زشت ہے۔ اسی طرح تصور شیخ کا شغل بھی محققین نے اکثروں کو بتلانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ سبب یہی ہے کہ تصور شیخ میں مرید کی پوری توجہ شیخ کی طرف ہوتی ہے۔ ذات باری کی طرف بالکل التفات نہیں ہوتا اور یہ غیبت (۳) کاملین کے ہاں جرم ہے خوب کہا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے گند آگاہ نباشی

(۱) مشکل مرض کو پہچان لیا (۲) مطلقا توجہ کرنا اگرچہ مناسب ہو لیکن جب اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً بری ہے (۳) ایسی بے توجہی۔

''اس بادشاہ سے ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی غافل نہ رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ متوجہ ہو اور تجھے خبر نہ ہو''

ممکن ہے کہ جس وقت یہ شخص پیر کے تصور میں مصروف ہے وہی وقت ادھر کی طرف کی توجہ کے نافع ہونے کا ہو۔ اسی کے جرم ہونے کو کہا گیا ہے ؎

ہر آں کو غافل از حق یک زمان ست   در آں دم کافراست امانہان ست

''جو تھوڑی دیر کے لئے ہی حق تعالیٰ سے غافل ہے اتنی دیر کے لئے کافر ہے اگرچہ ظاہر نہیں ہے۔

کفر سے مراد فقہی کفر نہیں اصطلاحی کفر ہے اسی لئے اس سے کاملین کی طبیعت اچٹتی ہے اور ان کو سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اوجھڑی کہ اس کو حلال تو ضروری کہیں گے اگر غلاظت سے صاف ہو لیکن ایک لطیف المزاج آدمی سے پوچھو کہ اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے۔

اور صاحبو! اصل تو یہ ہے کہ جب ایک دل میں دو خیال نہیں آسکتے۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں پھر کیوں کر کہا جائے کہ جو توجہ کہ اس میں خدا تعالیٰ کا خیال ضعیف اور مخلوق کا خیال غالب ہو۔ پھر اس کو قصداً پیدا کیا جائے، وہ مطلوب ہوگی۔

حضرت ابراہیم ادھم m کا واقعہ مشہور ہے کہ جب بیٹے سے جو شیخ محمود کے نام سے مشہور ہیں ملے اور مسرت کا جوش غالب ہوا تو ندا آئی کہ ؎

حب حق ہو دل میں یا حب پسر   جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

آخر وہ حجاب بھی مرتفع ہو گیا اور ان کا انتقال ہو گیا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیٹے سے بالکل ہی محبت نہ کرے جس قدر

(۵) اللہ کی طرف توجہ کرنے کا مفید وقت ہو۔

اس کا حق شرعی ہے وہ جب حق پر غالب نہ ہو عین سنت ہے۔ پس شیخ سے بھی ایسی محبت نہ ہونی چاہیے جو کہ خدا کو بالکل بھلا دے جیسا کہ آجکل جاہل فرقوں میں متعارف ہے۔ اسی طرح بیوی بچوں سے وہ محبت نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ رہے۔

لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللّٰہ (۱) ’’تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے چاہئیں‘‘

الطاف خداوندی کے قربان جایئے یہ حکم نہیں فرمایا کہ اولاد سے بالکل محبت نہ کرو کیونکہ جانتے ہیں کہ محبت اولاد طبعی ہے۔ امتثال ہو نہ سکے گا (۲) اس لئے یوں فرماتے ہیں کہ اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ خدا کو بھول ہی جاؤ۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو تو اس قدر مذموم ٹھہری اور جو غرض توجہ کی ہے وہ ضروری۔ پس اگر توجہ ترک کریں تو امر ضروری کا ترک لازم آتا ہے اور توجہ اختیار کریں تو امر مذموم (۳) کا اختیار لازم آتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ توجہ سے جو غرض ہے اس کا حصول توجہ ہی میں منحصر نہیں۔ کیونکہ اگر اس کا حصول اسی میں منحصر ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اسی طریق کو اختیار فرماتے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسی طریق میں اس کا انحصار نہیں ہے بلکہ دوسرا طریق بھی موجود ہے یعنی تعلیم وارشاد شفقت ودعا اور یہ طریق ایسا ہے کہ جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ کوئی اندیشہ۔

بات کہیں کی کہیں جا پڑی جو رسالہ دردنانہ غمناک کی نوعیت شعر یہ کے سلسلہ میں بڑھ گئی۔

---

(۱) سا ورۃ المنافقون:۹ (۲) اس حکم کی بجا آوری نہیں ہو سکے گی (۳) ناپسندیدہ کام۔

ثواب قرأت قرآن

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر مصنف کے سامنے اس کے کلام کو بے سمجھے بھی کوئی شخص محبت اور ذوق وشوق سے پڑھے تو اس کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب نوراللہ مرقدہ نے اس شخص کو رسالہ دردنامہ غمناک پڑھتے سنا تو آپ بہت خوش ہوئے اسی طرح کلام خداوندی کو جب ہم پڑھیں گے تو خدا تعالیٰ سنیں گے کیونکہ خدا سے تو کوئی چیز غائب ہی نہیں ﴿ مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ ﴾ [(۱)] ”کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ) نہ ہو اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو“

اور ﴿وَمَا تَكُونُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ﴾ [(۲)] اور ﴿ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ﴾ ”اور آپ ﷺ خواہ کسی حال میں ہوں اور منجملہ ان احوال کے آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور اسی طرح اور (لوگ بھی جتنے ہوں) تم جو کام کرتے ہو ہم کو سب خبر رہتی ہے جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو اور آپ کے رب کے علم سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں“۔

کہ خدا سے کوئی چیز بھی آسمان اور زمین کی اوجھل نہیں ہوسکتی۔ تو خدا تعالیٰ ضرور خوش ہوں گے اور متوجہ ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ کسی طاعت پر اتنا متوجہ نہیں ہوتے جتنا قرات قرآن پر متوجہ ہوتے ہیں۔ شاید کسی کو یہ

(۱) المجادلۃ: ۷ (۲) یونس: ۶۱۔

شبہ پیدا ہو کہ اس وقت سب لوگ سمجھ کر ہی پڑھتے تھے اس لئے اس وقت کی حالت پر یہ ارشاد ہوا ہے اس سے نہیں معلوم ہوتا کہ اگر بے سمجھے پڑھے تب بھی توجہ ہوگی۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف صرف عرب ہی کے لئے نہیں نازل کیا گیا۔ اور ساری دنیا کی زبان عربی ہی نہیں اور حدیث بشارت میں عرب کی تخصیص نہیں فرمائی گئی۔ اس کے علاوہ حدیث میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ سات آٹھ آدمی تلاوت قرآن شریف کررہے تھے۔ ان میں کچھ عربی تھے اور کچھ عجمی تھے۔ جن سے اچھی طرح پڑھتے بھی نہ بنتا تھا۔ اس وقت حضور ﷺ تشریف لائے اور سن کر ارشاد فرمایا کہ اقرؤا فکل حسن ۔معلوم ہوا کہ کچھ لوگ پورے طور پر قادر نہ تھے۔ پس جب حضور ﷺ نے سب کو حسن فرمایا تو معلوم ہوا کہ حسن ہونے کے لئے بالکل عرب کے موافق ہوجانا ضرور نہیں بلکہ کچھ کوتاہی بھی رہے جب بھی فضیلت حاصل ہے اور لفظی اور معنوی کوتاہی میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں (۱)۔ یہ تو حدیث تھی اور لیجئے کشف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ احمد بن حنبل m کی حکایت پہلے مذکور ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ سب سے زیادہ کون سی طاعت سے آپ خوش ہوتے ہیں۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ قرآن پڑھنے سے۔

امام احمد m نے پوچھا کہ سمجھ کر پڑھنے سے یا بلا سمجھے بھی ارشاد ہوا بفھم او بغیر فھم ۔پس معلوم ہوا کہ قرآن شریف خواہ کسی طرح پڑھا جائے۔ وہ ضرور مفید ہے خواہ سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے ہو اور اس کے پڑھنے سے خدا ہم سے ضرور خوش ہونگے یعنی ہم کو ثواب وانعام واکرام ہوگا۔ کیونکہ خدا کی خوشی کے یہ معنی نہیں جو ہماری تمہاری خوشی کے معنی ہیں کہ ایک بات جی کے موافق ہوئی طبیعت باغ باغ

(۱) لفظی اور معنوی کمی ہونے میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔

ہوگئی۔ جس کی حقیقت انفعال ہے(۱) خداوند جل وعلا طبیعت اور انفعال سے(۲) بالکل پاک ہے اس پر صفات کا اطلاق غایات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ مبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔

بہرحال قرآن کی تلاوت میں آپ نے سنا کہ کیا اجر عظیم ہے۔ افسوس ہے کہ اس اجر عظیم کو چھوڑ کر ہوا وہوس کے بندوں نے کلام اللہ کو جو کہ رضائے خداوندی کا ذریعہ تھا۔ دنیا طلبی کا ذریعہ بنالیا ہے کہ روپیہ لیکر اور مقرر کر کے قرآن سناتے ہیں۔ یہ صریح دین فروشی ہے۔

اجرت تعلیم

لیکن تعلیم قرآن کو اس پر قیاس نہ کیا جائے کیونکہ تعلیم قرآن پر تنخواہ لینا جائز ہے۔ اور اس جواز کے حنفیہ کے ہاں دو طریق ہیں۔ ایک تو یہ کہ امام شافعی m نے جائز کہا ہے۔ اور حنفیہ نے بوجہ ضرورت کے اس پر فتویٰ دیا ہے۔ لیکن یہ طریق بالکل کمزور ہے۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ابوحنیفہ m کی تقلید کا التزام کر کے بلا وجہ امام شافعی m کے مذہب پر عمل کریں۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ خود حنفیہ کا قاعدہ ہے کہ محبوس کا نفقہ من لہ الحبس (۳) پر ہوتا ہے۔ پس جب یہ شخص خدمت دین میں محبوس ہے اس کا نفقہ تمام اہل اسلام پر واجب ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی قسم کی خدمت دینیہ میں مشغول ہو سب کا یہی حکم ہے بعض مسلمانوں کا دے دینا بطور فرض کفایہ کے سب کو سبکدوش کردے گا۔

---

(۱) متأثر ہونا ہے (۲) طبعی تقاضوں اور متأثر ہونے سے منزہ ہیں (۳) جو آدمی کسی کے کام میں گھرا ہوا ہو اس کا نان نفقہ اس کے ذمہ ہوتا ہے جس کے کام میں وہ مشغول ہو۔

رہا یہ شبہ کہ اگر یہ بحیثیت نفقہ کے دیا جاتا ہے تو تنخواہیں کیوں مقرر کی جاتی ہیں۔ کیونکہ نفقہ بقدر کفایت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہٖ تو یہی حکم ہے مگر اس میں ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ عامل کہتا ہے کہ اب کے مہینہ میں میرے پچاس روپے خرچ ہوئے۔ دوسرے کہتے کہ بیس ہی ہوئے۔ جب روزانہ جھگڑے رہا کرتے تو سلسلہ تعلیم چند روز میں درہم برہم ہوجاتا۔ اس عارض کے لئے انتظاماً تعیین کی بھی اجازت ہوگی۔ جیسا کہ آب [۱] کے طاہر رہنے کے لئے اصل میں کثیر ہونا شرط ہے۔ لیکن نظم عوام کے لئے اس کی دہ دردہ [۲] کے ساتھ تقیید کردی گئی۔ یہ تقریر بالکل اصول حنفیہ کے موافق ہے۔

البتہ یہ تقریر ہر معلم کے لئے نہ چل سکے گی۔ بلکہ وہاں ہی چلے گی جو اپنے کو خادم دین سمجھ کر کام کررہے ہیں۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اگر موجودہ تنخواہ میں کام چل رہا ہو اور دفعۃً ترقی کی خبر آئے اور بجز ترقی کے اور کوئی مصلحت تعلق سابق کے قطع کرنے کی نہ ہو۔ پس اگر وہ شخص تعلق ترک کرکے چلا جائے تب تو سمجھنا چاہیے کہ طلب دنیا اس شخص کا اصلی مقصود ہے اور اگر ترک تعلق نہ کرے تو سمجھنا چاہیے کہ مقصود اصلی خلق اللہ کو دینی نفع پہنچانا ہے۔ معاوضہ اصل مذکور پر لیتا ہے ایک کے لئے جزاء حبس نہ ہوگا اور ایک کے لئے جزاء حبس سمجھا جائے گا۔ غرض اجرت تعلیم اس عدم جواز میں داخل نہیں۔

---

(۱) پانی کے پاک ہونے کے لئے اس کا زیادہ ہونا شرط ہے (۲) دس ہاتھ لمبا دس ہاتھ چوڑا جو حوض ہو اس کا پانی نجاست قلیل گرنے سے ناپاک نہیں ہوتا بلکہ پاک رہتا ہے۔

اجرت امامت

البتہ تراویح میں قرآن سنانے کا جو مروج قاعدہ اکثر مقام پر ہے وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ حافظ m نے خوب فرمایا ہے ؎

دام تزویر مکن چوں دگراں قرن را

اور اسی طرح مُردوں پر قرآن پڑھ کر دام لینے کا حال ہے کہ قرآن فروشی ہے اور ان کا قیاس تعلیم پر اس لئے نہیں ہوسکتا کہ تعلیم شعائر میں سے ہے اس خدمت کے لئے محبوس ہونا موجب جزاء ہے اور تراویح کا ختم اور ایصال ثواب یہ شعائر سے نہیں اگرچہ طاعت ہے (۱)۔ البتہ خود تراویح یا پنجگانہ نماز کی باجماعت یہ شعائر سے ہے اس کے لئے اگر مفت کا امام نہ ملے تو اجرت ٹھہرانا درست ہے۔

اس تمام تقریر سے قرآن شریف کا مشرف و معظم ہونا ثابت ہوگیا۔ پس جب ایسی معظم چیز رمضان میں نازل ہوگی تو رمضان شریف کیوں معظم و مشرف نہ ہوگا۔ قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس　　　رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

حرف حرفش راست در بر معنئے　　　معنئے در معنئے در معنئے (۲)

---

(۱) عبادت ہے۔ (۲) ''اے حق بات کے سمجھنے والے تو سمجھتا بھی ہے کہ قرآن کیا چیز ہے انسانوں کے پاس انسانوں کے رب کی شان دکھانے والا ہے۔ اس کے حرفوں میں بہت سے معنی پوشیدہ ہیں کہ ان حروف کے جو معنی ہیں ان معنی میں مزید معنی پنہاں ہیں اور ان معنی میں پھر مزید معنی پنہاں ہیں۔ اس کی مثال ''وامھاتکم التی ارضعنکم'' (تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے) ہے الفاظ رضاعی ماں کی حرمت بیان کرتے ہیں۔ ماں کی حرمت کے ساتھ اس کے اس شوہر کی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے جو اس دودھ کا سبب بنا پھر وہ تمام رشتے اس دودھ پینے کے سبب حرام ہوئے۔ جو نسب میں حرام ہوتے ہیں یحرم من الرضاعۃ مایحرم من النسب۔ پھر رضاعۃ کا معنی ہے عورت کا پستان کو بچے کے منہ میں دینا اور بچہ کا اس کو چوسنا۔ یہ معلوم ہونا مشکل ہے کہ دودھ پیا کہ نہیں تو اس پستان کو منہ میں لینے ہی کو دودھ پینے کا قائم مقام قرار دیں گے جیسے خلوت صحیحہ کو صحبت کا قائم مقام کرتے ہیں۔ پس قرآن کا سمجھنا فقہاء ہی کا کام ہے''۔ (خلیل)

دیدار خداوندی

رونما اس واسطے کہ خدائے تعالیٰ کو دنیا میں بلاواسطہ تو دیکھ نہیں سکتے۔ پس کلام اللہ کو پڑھنا۔ گویا دیدار خداوندی سے محظوظ ہونا ہے۔

اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے اس کی پوری حقیقت ظاہر ہوگی ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کے خیال میں اتفاقاً ایک مصرع یاد آ گیا ۔

درابلق کسے کم دیدہ موجود ''دُرِ ابلق کسی نے بہت ہی کم دیکھا ہوگا''

مصرع کہہ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن دوسرا مصرع تیار نہ کر سکے۔ شعراء کو جمع کیا اور مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ کسی سے مصرع نہ لگ سکا کیونکہ ایک مہمل مضمون ہے آخر سب کو زنداں(۱) کی دھمکی دی۔ ان لوگوں نے پریشان ہوکر ہندوستان میں عالمگیر کے پاس خط لکھا کہ تمہارے یہاں بڑے بڑے شاعر ہیں کسی سے مصرع کہلا کر ہماری جان بچاؤ۔ چنانچہ شعراء کو وہ مصرع دیا گیا۔ لیکن مضمون ایسا بے تکا تھا کہ کسی کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ شدہ شدہ زیب النساء(۲) متخلص بہ مخفی کو بھی اس کی خبر پہنچی اس نے بھی غور کیا لیکن مصرع نہ لگ سکا۔

اتفاقاً ایک روز مسند پر بیٹھی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی۔ آئینہ سامنے تھا کہ سرمہ کی تیزی سے آنکھ سے ایک آنسو گرا۔ اس کی ہیئت دیکھ کر فوراً دوسرا مصرعہ اس کے ذہن میں آ گیا۔

مگر اشک بتانِ سُرمہ آلود ''مگر معشوق نے جب سرمہ ڈال رکھا ہو تو سرمہ ملا ہوا آنسوں''

چنانچہ عالمگیر کو خبر ہوئی اور شعر پورا کر کے ایران بھیجا گیا۔ جب بادشاہ نے مصرع سنا اس کے اور تمام شعراء کے دل میں اس شاعر کی بڑی قدر ہوئی اور

(۱) قید خانہ میں ڈالنے کی دھمکی دی (۲) ہوتے ہوتے یہ مصرع زیب النساء تک پہنچا جس کا تخلص مخفی تھا۔

شاہ ایران نے عالمگیر کو لکھا کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دو۔

عالمگیر کو جب اس پیغام کی خبر پہنچی تو بہت زچ پچ ہوا(۱) کہ اگر شاعر کو ظاہر کرتا ہوں تب بھی مشکل ہے اور انکار کرتا ہوں تو بھی مشکل ہے آخر اس نے زیب النساء سے کہا کہ تمہاری شاعری کا یہ نتیجہ ہوا۔ زیب النساء نے کہا کہ تم اس کے جواب میں میری طرف سے یہ لکھ دو کہ ۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

''میں اپنے کلام میں اس طرح مخفی اور پوشیدہ ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول کے پتہ میں چھپی ہوئی ہوتی ہے جو شخص مجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے''

چنانچہ یہ لکھ بھیج دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ مستورات سے ہے پس اس طرح ہمارا مطلوب حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں۔ بوجہ اس کے کہ ہم اس کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے گویا یہ فرما رہے ہیں کہ ۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

''میں اپنے کلام میں اس طرح مخفی اور پوشیدہ ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول کے پتہ میں چھپی ہوتی ہے جو شخص مجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے'' اور وہ سخن یہی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے کہ ۔

معنئے در معنئے در معنئے ''معنی کے اندر معنی پھر معنی''

جس قدر زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف (۲) ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے لا تنقضی عجائبہ (۳) اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی

(۱) پریشان ہوا (۲) کھلتے جاتے ہیں (۳) عجائبات قرآن کبھی ختم نہ ہونگے۔

لطف آتا ہے اور عالم کو بھی مزا آتا ہے۔ صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے ۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را

''اس کے حسن کے عالم کی بہار دل کو اور روح کو تازہ رکھتی ہے اس کی رنگت سے صورت کو پسند کرنے والے خوش ہوتے ہیں اور اس کی خوشبو سے معنی کو پسند کرنے والے خوش ہوتے ہیں''

تلاوت قرآن کا لطف

اسی حدیث میں ہے لایخلق من کثرۃ الرد [1] واقع میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ کتنا ہی سنو جی نہیں بھرتا نیا مزہ آتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ سارا لطف خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ آخر وہ لطف اور وہ ربودگی جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی۔ اس میں وہ مزا کیوں نہیں حاصل ہوتا۔ اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزا آتا ہو تو وہ ابھی قابل خطاب ہی نہیں۔ اس کو چاہیے کہ صحت ادراک وسلامت حال پیدا کرنے کی کوشش کرے پھر موازنہ کرے۔ صاحبو! قرآن تو قرآن ہے۔ کبھی اگر مکہ میں جا کر وہاں کی تکبیر نماز میں سنو جو ایک جزو ہے قرآن کا تو معلوم ہو کہ کیا چیز ہے۔ سچ مچ اس وقت وہ تکبیر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ذبح کے وقت کی تکبیر کہ دل میں چھری نکلی چلی جاتی ہے لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آئے وہ تلاوت ترک نہ کرے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو اس وقت قرآن شریف پڑھیں گے کہ جب ہم کو مزہ آنے لگے مگر یہ خیال

(۱) کثرت تلاوت سے پرانا نہیں ہوتا۔

بالکل ہی لغو ہے(۱)۔

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص سے کہا جائے کہ تم مقویات کھا پی کر جلدی سے بالغ ہوجاؤ تاکہ تم کو سن بلوغ کے لطف حاصل ہوجائیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ صاحب پہلے سن بلوغ کی لذت کو میں دیکھ لوں کیسی ہوتی ہے۔ تب اس کی تدبیر کروں گا۔ فرمائیے کہ اس احمق کو کس طرح وہ لذت دکھلا دی جائے اور سوا اس کے اور کیا جواب اس کو دیا جائے گا کہ جب تم بالغ ہوجاؤ گے خود تم کو معلوم ہوگا۔ اس کے سوا کوئی تدبیر اس کے حصول کی نہیں۔

اسی طرح ان نابالغ پیروں کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس لذت کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ ہمت کر کے پڑھنے لگو۔ چند روز میں جب تمہارا قلب عالم طفلی سے نکل کر سن بلوغ میں (۲) پہنچے گا خود بخود اس کو یہ لذت حاصل ہوگی البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ خاص بلوغ اس وقت حاصل ہوگا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں ہوائے نفسانی(۳) کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً اس ہوائے نفسانی کا اتباع چھوڑ دو اور اطاعت خدا و رسول میں سرگرم ہوجاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہی ہے ؎

خلق اطفالند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

''سوائے اس شخص کے جو قوم کی محبت میں مست ہے ساری مخلوق نابالغ ہے سوائے اس شخص کے جس نے خواہشات نفسانی کو چھوڑ دیا ہے کوئی بھی نابالغ کہلانے کا مستحق نہیں ہے''

(۱) بے ھودہ (۲) بچپنے سے نکل کر بالغ ہوگا (۳) نفسانی خواہشات۔

ترغیب ذکر اللہ

بعینہٖ یہی غلطی اہل سلوک کو ہوتی ہے کہ وہ ابتداء میں یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذکر میں لذت آنے لگے اور جب لذت حاصل نہیں ہوتی تو پریشان ہوتے ہیں اور بعض اوقات ذکر کو چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ذکر میں لذت آنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ ذکر کی زیادتی کرے جس قدر ذکر زیادہ ہوگا قلب زیادہ منقاد ہوگا(۱)۔ دوسرے خیالات کمزور پڑیں گے۔ ذکر میں خود بخود لذت حاصل ہوگی۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ فن شاعری میں جو ملکہ پیدا ہوجاتا ہے کہ ایک شعر سن لیا اور طبیعت تلملا گئی۔ ایک عمدہ بات کان میں پڑی کہ چہرہ کھل گیا۔ آخر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اور کثرت مشق سے ہوتی ہے اور ابتداء سے ہرگز یہ حالت نہیں ہوتی۔ بلکہ اول اول تو محض مشقت ہوتی ہے۔

دیکھئے بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں۔ سبق فارسی کا پڑھاتے ہیں مارتے ہیں پکڑ بلاتے ہیں۔ اسی طرح جب سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اس کو زبان دانی وسخن فہمی کا ایسا سلیقہ پیدا ہوجاتا ہے کہ کلام لطف سن کر کیسا کچھ محظوظ ہوتا ہے۔ پس کیا کسی شخص نے محض اس وجہ سے کہ ہم کو غالب اور مومن کا سا وجد کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ شاعری کی مشق چھوڑ دی ہے یا کسی شاگرد نے اپنے استاد سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں اس وقت شاعری کروں گا کہ جب آپ کی طرح مجھے شعر میں لطف آنے لگے گا۔ صاحبو! کیا قرآن شریف کی تلاوت اتنی بھی ضروری اور مرغوب نہیں

(۱) دل زیادہ صاف ہوگا۔

جتنی فارسی اور شاعری کی تحصیل۔

صاحبو! جس طرح اس مثال میں ظاہری کیفیات میں ایک وقت وہ تھا کہ نہ تھیں اور اب ایک وقت وہ ہے کہ علیٰ وجہ الکمال ہیں اسی طرح باطنی کیفیات بھی گو اس وقت حاصل نہیں لیکن اگر کام کیے جاؤ گے تو ایک وہ وقت بھی ضرور آئے گا کہ سب حاصل ہو جائیں گی ارشاد ہوتا ہے: کذلك كنتم من قبل فمن اللّٰه عليكم(۱)

اندریں راہ می تراش وی خراش تادمے آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دم آخر بود کہ عنایت باتو صاحب سر بود

''اس راستہ میں آخر دم تک تراش وخراش (محنت ومشقت) ہے فارغ مت رہ تاکہ تیرا آخری سانس آخر وقت تک شاید اللہ کی مہربانی سے کار آمد ہو جائے''

اس قسم کے مواقع پر حضرت حاجی امداداللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ یہ پڑھا کرتے تھے ؂

یا بم اورا یا نہ یابم جستجوئے می کنم حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

''میں اس کو پاسکوں یا نہ پاسکوں اس کی جستجو کرتا رہوں گا حاصل ہو یا نہ ہو اس کی تمنا کرتا رہوں گا''

جو کچھ بھی ہو تم کام کئے جاؤ۔ تمہارا کام محض طلب ہے کیونکہ تمہارے اختیار میں وہی ہے۔ ثمرہ کا ملنا نہ ملنا یہ ان کا کام ہے تم اس کے درپے نہ ہو ؂

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد ازو غیر اوتمنائے

(۱) تم پہلے ایسے ہی تھے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا۔

''جدائی اور ملاقات کی پرواہ نہ کر، معشوق کی خوشنودی ڈھونڈ کہ اس سے اس کے سوائے دوسری چیز طلب کرنا قابل افسوس ہے''

ایک دوسرے بزرگ اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں ؎

ارید وصالہ ویرید ہجری	فاترک ما ارید لما یرید

''میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی چاہتا ہے پس میں اس کے ارادہ کو اپنے ارادہ پر قربان کرتا ہوں اور چھوڑتا ہوں''۔

طلابین کا حال

اور صاحبو! اگر یہ نہ کہا جائے تو کیا خدا سے بدلہ لینا ہے اگر وہ ہمارا کام نہیں کرتے تو ہم اس کا کام کیوں کریں۔ غور کریں اگر ایک مردار بازاری عورت سے تعلق ہوجاتا ہے تو قلب پر کیا کیا صدمے گزرتے ہیں۔ کس کس انداز سے وہ امتحان اور آزمائش کرتی ہے۔ کتنا موقع بموقع ستاتی ہے لیکن آتش محبت مشتعل ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امتحانات یا غموں سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دیں۔ تو کیا ذات باری جل مجدہٗ کی محبت اور عظمت مسلمان کے دل میں اتنی بھی نہ ہو جتنی ایک بازاری عورت کی۔ حیف ہے ہم پر اور ہمارے اس اسلام پر ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود	گوئے گشتن بہرا و اولےٰ بود

''کیا مولیٰ کا عاشق لیلیٰ سے بھی کم درجہ میں ہوسکتا ہے گلی کوچوں میں اس کے لئے گشت کرنا تو اور بھی زیادہ بہتر بات ہے''

ایک عارف کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ایک روز یہ آواز آئی کہ کتنی ہی عبات کرو کچھ قبول نہیں۔ اس آواز کو ان کے ایک مرید نے بھی سنا۔ دوسرا دن ہوا تو وہ

بزرگ پھر عبادت کے لئے اٹھے پھر وہی آواز آئی۔ جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مرید نے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں ادھر کوئی پوچھتا بھی نہیں اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ گرے جاتے ہیں جب قبول ہی نہیں تو محنت سے کیا فائدہ۔ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا ۔

توانی ازاں دل پر داختن　　　　که دانی که بے اوتواں ساختن

کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس در پر جا پڑوں۔ اس جواب پر رحمت باری کہ ۔

قبول است گرچہ ہنر نیستت　　　　کہ جز ما پنا ہے دگر نیستت

’’ اگر چہ تمہاری عبادت کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر ہمارے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں تو تمہاری یہ بے ڈھنگے پن کی عبادات قبول کر لی گئیں‘‘

کہ اگر چہ تمہاری عبادت تو کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر! جب ہمارے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے تو تم کو بھی ہم ہی لے لیں گے۔ صاحبو! طالبین کی یہ حالت ہونی چاہیے کہ ۔

طلب گار باید صبورو حمول　　　　کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

’’کسی چیز کے طلب کرنے والے کو صبر اور برداشت کرنا چاہیے میں نے کسی کیمیا گر کو مایوس اور آبدیدہ ہوتے نہیں دیکھا‘‘

طلب الٰہی کی ترغیب

افسوس ہے کہ طلب کیمیا کے بھی برابر نہ ہو کہ اس میں تو انسان سالہا سال گنوا دے مال و متاع غارت کر دے چین و آرام کو خیر باد کہہ دے اور طلب خدا میں

کچھ بھی نہ ہو سکے۔ طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

بر انداز برائے دلے بارہا خورند از برائے گلے خارہا

''اپنے دل کو بار بار اس کے راستہ پر چلا پھول حاصل کرنے کے لئے تو بہت سے کانٹوں کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے''

اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

خوشا وقت شورید گان غمش اگر ریش بینندو گر مئیست
گدایانے ازپاد شاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم در کشند اگر تلخ بینند دم در کشند

''اس کے غم میں مبتلا رہنے والوں کے لئے بہت ہی خوش نصیبی ہے چاہے کوئی زخم لگے یا زخم کا مرہم ملے اس کے فقیر بادشاہی سے نفرت کرتے ہیں اس کی مہربانی کی امید میں گدائی ہی پر صبر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مشتاق عشق کے غم کی شراب پیتے رہتے ہیں اگر کسی قسم کی تلخی بھی دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں''

اور جو شخص صرف مرہم کا طالب ہو وہ طالب نہیں ہے۔ وہ بیچارے تو بجائے حصول کے امید پر ہی نظر لگائے بیٹھے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے شعر میں ہے ؎

بامیدش اندر گدائی صبور ''اس کی امید پر گدائی پر بھی صبر کرنے والے ہیں''

ایک طالب کا قول ہے ؎

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

''اگرچہ میں دور پڑا ہوا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا

معشوق پھر دوسری بار میرا ہاتھ پکڑ لے‘‘

طالب وہی ہے کہ اگر ہزار اس کو کہا جائے تو دوزخی ہے تو مایوس نہ ہو اور دس ہزار مرتبہ کہا جائے کہ تو جنتی ہے تو کاہل اور سست نہ بنے اس کے طلب کی یہ حالت رہے ۔

اے برادر! بے نہایت در گہی است ہر کہ بروے می رسی بروے مئیست

’’اے بھائی اس کے دربار کی کوئی انتہا نہیں کہ کسی جگہ پہنچ کر کوئی یہ کہہ دے کہ میں منزل پر پہنچ چکا ہوں، اگر تو کسی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اوپر دوسری منزل ہے‘‘

ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ اس کو روزانہ یہ آواز آتی کہ تو کافر ہو کر مرے گا جب ایک مدت تک یہ آواز آئی تو شیخ سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں یہ دشنام محبت ہے۔ مایوس نہ ہوجانا۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ محبّ کو چھیڑا کرتے ہیں۔ خوب کہا ہے ۔

بدم گفتی وخورسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

’’تو نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تجھ کو معاف کرے تو نے ٹھیک کہا ہے، میٹھے میٹھے سرخ ہونٹوں سے کڑا جواب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے‘‘

اور یہ ایک قسم کا امتحان ہے لیکن یہ ساری باتیں اس وقت برداشت ہوتی ہیں کہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو۔ پس اس کی کوشش کرو اور اس طریق کے دوامر ہیں۔ ذکر کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت، ان کے پاس آنا جانا۔ اس سے تدریجاً ما سوائے اللہ (۱) سب تمہارے دل سے نکلنے شروع ہوجائیں گے اور یہ

(۱) اللہ کے علاوہ سب کی محبت دل سے نکل جائے گی۔

حالت ہوگی۔

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

''عشق آگ کا ایسا شعلہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے تو معشوق کے سوائے جو کچھ ہوتا ہے سب کو جلا دیتا ہے''

تیغ لا در قتل غیر حق براند ورنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند
ماند الااللہ باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

''لفظ لا کی تلوار سے اللہ کے سوا ہر معبود کو دور کردے پھر دیکھ اب کیا باقی رہ گیا۔ صرف الا اللہ باقی رہ گیا باقی سب کچھ چلا گیا۔ مبارک ہو اے عشق کہ تو دوسروں کی شرکت کو جلانے والا اور دور کرنے والا ہے''

ترتیب سلوک

اس تقریر سے ترتیب سلوک کی یہ نکلی کہ اول کسی صاحب محبت کو ڈھونڈ کر اس کے پاس جا پڑو اور اس کی حسب ہدایت کام میں لگ جاؤ۔ ثمرات کے طالب نہ ہو خود بخود ہوں تو خدا کا فضل سمجھو۔ طاعت میں لذت نہ ہو تو اس کو چھوڑو مت۔ کثرت سے ذکر کرو۔

اس میں قرآن بھی داخل ہے۔ اگر پڑھتے ہوئے طبیعت اکتانے لگے، تو اسی کی کثرت کرو۔ اگر الفاظ بھی صحیح نہ ہوں تو امکان بھر کوشش تصحیح کی کرو۔ اگر پوری کامیابی نہ ہو تو دلگیر مت ہو اسی طرح قبول ہے۔ الفاظ پر تو انہیں سے گرفت ہوگی جو الفاظ درست کر سکتے ہیں اور پھر نہیں کرتے۔ ورنہ زیادہ تر دیکھ بھال، اور چھان بین دلوں کی ہوگی۔ اگر موٹی زبان کا آدمی غلط پڑھتا ہے لیکن دل سے پڑھتا ہے تو

خدا کے نزدیک یہ غلط اس صحیح سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی غرض ریا یا اظہار کمال ہو۔

نرمی وسختی علاج کے دوطریقے

اس موقع پر مجھے ایک شخص کی حکایت یاد آئی۔ایک شخص مجھ سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں کسی فقیر سے طالب ہوجاؤں۔ میں اس پر ناراض ہوا اور سمجھادیا چند روز کے بعد پھرآیا تو میں اس سے مزاحًا کہنے لگا کہ کیوں کسی فقیر کے طالب بھی ہوئے؟ تو وہ نہایت خلوص اور سادگی سے جواب دیتا ہے کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا ہے۔اس کا یہ ''تیرا'' کہنا ہزاروں حضور اور جناب سے زیادہ لذت بخش تھا کیونکہ دل سے تھا۔

اس موقع پر بطور جملہ معترضہ کے ایک اور بات بھی کہہ دینی ضروری ہے کہ جس طرح نرمی علاج ہے گرمی بھی اس سے بڑھ کر علاج ہے اور یہی وجہ ہے بعضے بزرگ درشت مزاج(۱)مشہور ہوجاتے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ وہ درشت مزاج نہیں۔ بات یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک بات کو نرمی سے سمجھایا جائے تو دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا اور نہ وہ اتنی مدت تک یاد رہتی ہے جتنا کہ بدرشتی سمجھانے سے کالنقش علی الحجر ہوجاتی ہے (۲)۔چنانچہ اس ڈانٹ کا یہ اثر پڑا کہ اس کا یہ تذبذب بالکل دل سے نکل گیا اور آنکھیں کھل گئیں۔غرض غلط بولنا جو پیارا معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

شبان موسیٰ کا قصہ

چنانچہ حضرت موسیٰ d کے زمانہ میں راعی کا قصہ مشہور ہے کہ زمین پر

(۱)سخت مزاج (۲) پتھر پہ نقش کی مانند ہوجاتی ہے۔

بیٹھا ہوا محبت کے جوش میں خدائے تعالیٰ کو خطاب کر کے یہ کلمات کہہ رہا تھا ۔

تو کجائی تا شوم من چاکرت چارقت دوزم کنم شانہ سرت

''تو کہاں ہے کہ میں تیری خدمت کروں تیرے پھٹے ہوئے کپڑے سی دوں اور تیرے سر کے بالوں کو کنگھی کر دوں''

وامثال ذالک(۱) اتفاقاً حضرت موسیٰ d اس طرف سے گزرے۔ یہ کلمات سن کر فرمایا کہ میاں کس کو کہہ رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ خدا سے۔ حضرت موسی d نے ڈانٹا اور ڈانٹ کر چلے گئے۔ راعی نے جو یہ سنا تو مارے خوف کے تھرا گیا(۲) اور سخت پریشان ہوا۔ اسی وقت حضرت موسیٰ d پر وحی آئی کہ اے موسیٰ! تم نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کردیا۔ اسی حکایت کو مولانا روم m فرماتے ہیں ۔

زیں نمط بیہودہ می گفت آں شباں گفت موسی d باکیست ایں اے فلاں
گفت با آں کس کہ مارا آفرید ایں زمین و چرغ ازوآمد پدید
گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدے خود مسلمان ناشدہ کافر شدے
گفت اے موسی دہانم دوختی وز پشیمانی تو جانم سوختی
وحی آمد سوئے موسی d از خدا بندہ مارا چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

''اس طریقہ پر وہ چرواہا فضول باتیں کر رہا تھا۔ حضرت موسی d نے پوچھا اے شخص تو یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہے چرواہے نے کہا کہ میں اس ذات پاک سے بات کر رہا ہوں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور یہ زمین و آسمان اسی کے

(۱) اسی قسم کے الفاظ کہہ رہا تھا (۲) ڈر کے مارے کانپنے لگا۔

پیدا کئے ہوئے ہیں۔ حضرت موسی d نے فرمایا ہائے افسوس تو برباد ہوگیا تو خود مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہوگیا۔ چرواہے نے کہا کہ اے موسی d تو نے میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے تو نے میری جان کو جلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسی d پر وحی نازل ہوئی کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کیوں کر دیا تو مجھ سے ملاقات کرانے کو آتا ہے یا میرے بندوں کو مجھ سے جدا کرانے کے لئے آتا ہے''۔

حضرت موسی d نے جو یہ سنا تو گھبرا گئے اور جلد ہی آکر چرواہے سے معافی چاہی یہاں چرواہے کی عجب حالت تھی۔ موسیٰ d نے جب معافی چاہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ اے موسی d ایسا تازیانہ لگا ہے کہ میں بڑی دور پہنچ گیا ؎

آفرین بردست و بر بازوئے تو ''تیرے ہاتھوں اور بازوؤں کو شاباش ہے''

اس جملہ حکایت سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اگر زبان پر بوجہ کم سمجھی اور کم عقلی کے گستاخانہ الفاظ بھی ہوں لیکن دل محبت سے معمور ہو تو الفاظ پر نظر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان فروگزاشتوں کی معافی انہی لوگوں کے لئے ہے کہ جن کو تصحیح پر قدرت نہیں ہے ورنہ اگر قدرت کے باوجود ایسا کرے تو ضرور گنہگار ہوگا۔

تفریط متعلمین

افسوس ہے کہ اس وقت اس امر کی طرف سے ایسی بے توجہی ہے کہ لوگ اس کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر لوگ پوری درسیات ختم کر جاتے ہیں لیکن ان کو قرآن پڑھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ سمجھتے ہیں کہ صرف کی کتابوں میں صفات حروف و مخارج پڑھ لئے ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ قرآن کا پڑھنا اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ خاص کسی سے اس کو نہ سیکھا جائے۔ نری درسیات سے کچھ نہیں ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشق نہیں کی تو ہم کو غلط پڑھنا جائز ہونا چاہیے اور ہم کو معذور ہونا چاہیے لیکن یہ عذر ایسا ہے کہ میں نے ایک سپارہ پڑھنے والے طالب علم سے کہا کہ حاجی جی کو بلالا۔ وہ حافظ جی کو بلالایا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا حماقت ہے؟ کہاں حافظ جی کہاں حاجی جی۔ ان کے تو حروف بھی الگ الگ ہیں۔ تو کہتا ہے جی میں نے مخارج کی مشق نہیں کی۔ تو کیا یہ عذر قبول ہوسکتا ہے؟ تو جیسا یہ شخص اس غلطی سے بچ سکتا ہے اسی طرح جب مشق ممکن ہے تو ایسی اغلاط سے ان کو بچنا ممکن ہے۔

صاحبو! یہ سب بہانے ہیں۔ بات اصلی وہی ہے کہ خدا کی محبت اور اس کا خوف دل سے جاتا رہا ہے۔ اگر آج یہ اشتہار دے دیا جائے کہ جو شخص مخارج حروف صحیح کر کے سنادے اس کو فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو آج ہی شہر کے شہر قرأت شروع کردیں اور کچھ نہ کچھ تصحیح کر کے انعام لینے کھڑے ہوجائیں لیکن افسوس ہے کہ خدا کی رضا کے لئے امنگ نہیں پیدا ہوتی۔ یہ تو تفریط تھی متعلمین کی۔

افراط معلمین

اب افراط سنیئے۔ بعض معلمین و مصلحین کا کہ جن سے بالکل نہ ہوسکے وہ ان کو بھی مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدوں اس کے قرآن پڑھنا ہی بے فائدہ ہے۔

جیسا مشہور ہے کہ ایک پیر جی صاحب نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ روزہ کی نیت بھی یاد ہے۔ اس کو چونکہ خاص عبارت یاد نہیں تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں بتلائی۔ پیر جی صاحب نے فرمایا کہ بے نیت روزہ نہیں ہوتا۔ دیکھ روزہ کی نیت یوں کیا کر بصوم غد نویت اس بے چارے نے کاہے کو کبھی اس قسم کے الفاظ سنے تھے فوراً تو یاد نہ کرسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن روزہ نہ رکھا۔ ان ہی

بزرگ نے پوچھا تو یہ کہا کہ بلا نیت روزہ نہیں ہوتا اور نیت یاد نہیں ہوتی۔ غرض جو لوگ صحیح پڑھ سکتے ہیں وہ تو صحیح پڑھیں۔ اور جو لوگ اس پر قادر نہیں ان کو جس طرح وہ پڑھ سکیں جائز ہے۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہماری آواز چونکہ اچھی نہیں اس لئے ہم نہیں پڑھتے سو ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ تحسین صورت اس کو نہیں کہتے کہ خوب راگنی سے گا کر پڑھا جائے تحسین صورت کے معنی جیسا بزرگوں سے منقول ہے یہ ہیں کہ سننے والے کو اس کی آواز سن کر یہ معلوم ہو کہ اس کے دل پر کسی باعظمت ہستی کا رعب چھایا ہوا ہے۔

فضیلت عشرہ اخیرہ

بات بہت دور جا پڑی۔ اصل مقصود یہ تھا کہ جب قرآن ایسا مشرف ومعظم ہے تو جس ماہ میں اس کا یہ نزول دفعی (۱) ہوا ہے وہ بھی معظم ہوگا بالخصوص وہ عشرہ خاص ماہ رمضان کا کہ جس میں شب قدر ہے کیونکہ رمضان کو جب قرآن شریف کی وجہ سے شرف حاصل ہوا۔ تو رمضان کا وہ حصہ خاص جس میں نزول ہوا ہے دوسرے حصوں کی نسبت خاص کر ضرور اشرف ہوگا۔ اس لئے کہ دوسرے حصوں میں شرف اس حصہ کی بدولت آیا ہے۔ پس جب نزول شب قدر میں ہوا ہے اور شب قدر جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے تو عشرہ اخیرہ بقیہ حصہ رمضان سے ضرور افضل ہوا۔ ایک فضیلت تو عشرہ اخیرہ کی اس نزول قرآن سے ہوئی۔

دوسری فضیلت اس کی اس سے ہے کہ اس میں شب قدر ہے جس کی

(۱) یکبارگی نزول۔

فضیلت کے لئے خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ○ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ○ ﴾(۱) ”آپ ﷺ کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر کیسی چیز ہے شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے“ کیونکہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر عشرہ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے یعنی ۲۱۔۲۳۔۲۵۔۲۷۔۲۹۔ اور بعض حدیثوں میں مطلق عشرہ اخیرہ بھی آیا ہے۔ دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری کی تفسیر ہے اور یا اکثر تو طاق راتوں میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جفت راتوں(۲) میں بھی ہوجاتی ہے۔ نیز بعض لوگوں کو جفت راتوں کو بھی ہونا مکشوف ہوا(۳) ہے۔ تو قوی اور تندرست لوگوں کو تو یہ مناسب ہے کہ وہ اس عشرہ کی ہر رات میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کریں اور ضعفا کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کم از کم طاق راتوں میں ضرور جاگ لیں۔ طاق راتوں میں سے اس وقت ایک رات تو گزر گئی اب صرف چار باقی رہ گئی ہیں۔ اس میں کوشش کر کے کچھ تو ضرور جاگ لیا جائے۔

صاحبو! یہ ایسی برکت اور خیر کی چیز ہے کہ اس سے محروم ہوجانا۔ گویا تمام خیر سے محروم ہوجانا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔(من حرم ليلة القدر فقد حرم الخير كله)(۵) ”جو شخص لیلۃ القدر (میں عبادت کرنے سے) محروم رہا وہ خیر سے بالکل محروم رہا“ لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر جاگا جائے تو تمام شب جاگا جائے اور اگر تمام شب نہ جاگا جائے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ خیال بالکل لغو ہے۔ اگر اکثر حصہ شب میں بھی جاگ لے تب بھی لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر ساری رات بھی جاگ لیا

(۱) سورۃ القدر (۲) وہ راتیں جو برابر تقسیم ہوسکتی ہیں جیسے ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۸، ۳۰، (۳) بعض بزرگوں کو شب قدر جفت راتوں میں ہونے کا کشف ہوا ہے (۴) لم أجد الحديث في ”موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف“۔

جائے تو کیا مشکل ہے۔

صاحبو! رمضان شریف سال بھر کے بعد آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پچھلے سال رمضان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں رہے۔ ہم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ رمضان تک کس کس کی باری ہے۔ اس لئے اگر ایسی بڑی نعمت حاصل کرنے کے لئے کوئی ایک دورات جاگ ہی لیا تو کیا دقت کی بات ہے۔ لیکن خیر! اگر تمام رات کی ہمت نہ ہو تو اکثر حصہ کو تو چھوڑنا ہی نہ چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ یہ اکثر حصہ اخیر شب کا تجویز کیا جائے۔ کیونکہ اول تو اس وقت تک معدہ کھانے سے پر نہیں ہوتا۔ دعا میں جی لگتا ہے۔ دوسرے حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ اخیر شب میں روزانہ اپنے بندوں کے حال پر رحمت خاص متوجہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ اخیر شب میں ویسے بھی سکون ہوتا ہے اور اس میں ہر شب شریک ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے (من لم یعرف قدر لیلۃ لم یعرف لیلۃ القدر) اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر انہی راتوں میں سے کسی رات میں ہوگی تو جو شخص راتوں کی قدر کرے گا وہ لیلۃ القدر بھی پائے گا۔ جو بے قدری کر کے خواب غفلت میں گزارے گا وہ حسب عادت لیلۃ القدر سے بھی محروم رہے گا۔ کیونکہ جب سال بھر تک برابر شب بیداری کرے گا تو لیلۃ القدر میں عبادت ضرور ہو جائے گی۔ کہ انہی راتوں میں ایک رات وہ بھی ہے۔

بوستان میں حکایت ہے کہ کسی شہزادہ کا ایک لعل شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اٹھا کر جمع کریں۔ اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جاتیں تو ممکن تھا کہ لعل ان میں

نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اٹھائی گئی ہیں تو لعل ضرور آ گیا ہے کسی نے اس جملہ کا ترجمہ خوب کیا ہے ؎

اے خواجہ چہ پرسی ز شب قدر نشانی   ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

''اے میاں تو شب قدر کی نشانی کو کیا پوچھتا ہے ہر رات قدر کے قابل ہے اگر تو اس کی قدر کرے''

شب قدر کی فضیلت

لیکن خیر ایسے باہمت تو اس وقت تک کہاں ہیں کہ وہ اس گوہر بے بہا کی تلاش میں سال بھر شب بیداری کریں مگر رمضان کے عشرہ اخیرہ میں تو ضروری بیدار رہنا اور عبادت کرنا چاہیے کیونکہ ان راتوں میں شب قدر کا ہونا اغلب ہے اگر کوئی شخص نہایت ہی کمزور اور کم ہمت ہو تو خیر وہ ستائیسویں رات کو تو ضروری ہی بیدار رہے۔ کہ وہ شب اکثر شب قدر ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شب قدر نہ بھی ہوئی۔ اور تم نے بہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو ان شاء اللہ تم کو شب قدر ہی کا ثواب عطا ہوگا۔ اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے۔ حدیث میں اس کی اصل ہے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔ انما الاعمال بالنیات پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کو تشفی نہ ہو تو دوسری حدیث موجود ہے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: (الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون والاضحٰی یوم تضحون)(۱)

جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی وراس تحقیق کی بناء پر روزے رکھنے شروع کر دیئے پھر ختم رمضان پر

(۱) سنن الترمذی: ۶۹۷، کنز العمال: ۲۳۷۶۰۔

عید کے چاند کی اسی طرح چھان بین کی اور اس کی بناء پر عید کرلی اسی طرح عیدالاضحٰی میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلاف واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ جس دن روزہ رکھا وہی دن عنداللہ باعتبار مقبول روزہ کا تھا۔ اور جس دن عید کی وہی دن عید کا تھا یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں۔ پس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شب قدر نہ ہوئی تو ثواب شب قدر کامل جائے گا۔

صاحبو! اس تقریر کے بعد تو بہت ہی آسان معاملہ ہوگیا۔ اب بھی اگر ہمت نہ کی جائے تو غضب ہے۔ یہ دوسری فضیلت تھی عشرہ اخیرہ کی۔

فضیلت اعتکاف

تیسری فضیلت اس عشرہ میں یہ ہے کہ اس میں اعتکاف مشروع ہے اور ممکن ہے کہ یہ پہلی فضیلت کا تتمہ ہو جیسا کہ بعض نے کہا کہ اعتکاف کو دوسری حکمتوں سے بھی مشروع کہا جائے۔ خیر جو کچھ بھی ہو ہم کو اس سے کیا غرض۔ ہم کو کام کرنا چاہیے۔ احکام کے حکم اور مصالح کی تلاش اور کاوش ہمارا کام نہیں۔ کیونکہ یہ علوم فکر یہ نہیں ہیں کہ سوچنے اور غور کرنے سے سمجھ میں آجائیں گے۔ یہ الہامی علوم ہیں خدا جس کو دے اس لئے جب تک شرح صدر نہ ہوجائے اس وقت تک کسی ایک تو تعیین نہ کرنی چاہیے دونوں احتمال ہیں۔ اس اعتکاف میں دو درجے ہیں۔ ایک درجہ کمال کا ہے وہ تو یہ ہے کہ بیس تاریخ کو قبل از مغرب اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر باہر نکلے۔ سو یہ تو اب ممکن نہیں ہے کیونکہ ایک دن گزرگیا۔ اور دوسرا درجہ اس سے کم ہے اور وہ یہ کہ دس دن سے کم ہو لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر درجہ کمال حاصل نہ ہو تو ناقص درجہ کے حاصل کرنے سے فضیلت

حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس قدر نہ ہوگی تو کچھ تو ضرور ہو جائے گی۔

صاحبو! اگر دس دن ممکن نہ ہو سکے نو دن سہی۔ اس قدر بھی نہ ہو سکے سات دن سہی۔ غرض جس قدر بھی ہو سکے اور جتنے دن بھی ہو سکے چھوڑنا نہ چاہیے۔

ایک بہت بڑی فضیلت اعتکاف کی یہ ہے کہ معتکف کو ایام اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نماز میں ملتا ہے دلیل اس کی یہ حدیث ہے۔ لا یزال احدکم فی الصلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ (۱) جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا جائے تو وقت انتظار میں بھی وہی ثواب ملتا ہے جو کہ وقت ادا الصلوٰۃ میں ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معتکف جب ہر وقت مسجد میں رہے گا تو اس کو صلوٰۃ کا انتظار ضرور رہے گا۔ اگر یہ سووے گا بھی تو اس نیت سے کہ اٹھ کر فلاں نماز پڑھنی ہے۔ کوئی کام بھی کرے گا تو اس نیت کے ساتھ کہ فلاں نماز تک یہ کام ہے۔ غرض اس کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا ہر ہر حرکت صلوٰۃ کے حکم میں لکھی جائے گی۔

اس تقریر کے بعد خیال میں آتا ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے المعتکف یعتکف الذنوب کلھا ویجری لہ الحسنات کلھا۔ (۱) ''معتکف تمام گناہوں سے رکا رہتا ہے اور تمام نیکیوں کا اس کو ثواب ملتا ہے'' الحسنات میں الف لام عہد کا نہیں جیسا اب تک سمجھا جاتا ہے۔ جس کی بنا تھی کہ اعتکاف میں خاص حسنات کا صدور ہوتا ہے کل حسنات کا صدور خلاف مشاہدہ ہے۔ بلکہ استغراق کا ہوسکتا ہے مطلب یہ ہے کہ معتکف اپنے ایام اعتکاف میں گویا ہر نیکی کر رہا ہے اس کو سب نیکیوں کا ثواب ملتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انتظار صلوٰۃ کے حکم میں

(۱) الصحیح للبخاری: ۱: ۱۶۶، ۱۶۸، کنز العمال: ۱۹۰۸۲۔

ہے اور معتکف منتظر صلوٰۃ ہے تو وہ مصلی کے حکم میں ہوا، اور صلوٰۃ ام العبادت ہے[1] تو اس کا ادا کرنے والا گویا تمام عبادتیں کررہا ہے پس معتکف بحالت اعتکاف سب عبادتیں ادا کررہا ہے۔ صاحبو! اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی۔

یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ عشرہ اخیرہ میں ایک فضیلت اعتکاف سے ہوئی اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اعتکاف میں جو فضیلت آئی ہے وہ عشرہ اخیرہ کی وجہ سے کہ زمانہ افضل میں عبادت کی زیادہ فضیلت ہوتی ہے لیکن یہ ہم کو کچھ مضر نہیں کیونکہ کبھی زمانہ میں بالذات ہی فضیلت ہوتی ہے جیسا کبھی بالغیر بوجہ اسکے مظروف کے ہوتی ہے۔ جیسا شروع میں بیان ہوا بعد حکایت گفت معشوقے بعاشق۔ الخ کے۔ پس غرض خواہ اعتکاف میں عشرہ کی وجہ سے فضیلت ہو یا عشرہ میں اعتکاف کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں اعتکاف کی فضیلت ثابت ہے ہم کو اس کا حاصل کرنا ضروری ہے اس کرید کی ضرورت نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

”نصیبہ اگر مدد کرے تو میں اس کے دامن کو اپنے ہاتھ سے پکڑلوں اگر وہ اپنی طرف کھینچ لے تو بڑی خوشی کا مقام ہے اور اگر میں اسے اپنی طرف کھینچ لوں تو یہ بھی میرے لئے عزت کی بات ہے“

صاحبو! چار دواؤں کا مرکب آپ کے مرض کو مفید ہے آپ کو اسے استعمال کرنا چاہیے۔ اس تفتیش کی ضرورت نہیں کہ اس دوا سے اس میں قوت بڑھی یا اس دوا سے۔ اس میں یہ تفتیش دوسرے کا کام ہے جو اس فن کو من حیث الفن حاصل کرے مریض کا کام صرف استعمال ہے ؎

---

(۱) تمام عبادات کی اصل ہے۔

کارکن کار بگذاراز گفتار کاندریں راہ کار باید کار
قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد بے قدم

’’کام کرو باتیں کرنے کا کام چھوڑ دو کہ اس راستہ میں صرف کام ہی کام چاہیے، اس راستہ میں کام کے لئے قدم چاہیے باتیں بنانے کی ضرورت نہیں کہ بغیر عمل باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے‘‘

یہ فضیلت تو اس عشرہ کے ساتھ خاص تھی اب ایک اور مضمون عام جو اس عشرہ اخیرہ کے ساتھ بھی چسپاں ہے بیان کیا جاتا ہے۔

فضیلت خدمت والدین

وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ j کے مجمع میں فرمایا: رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ(۱) صحابہ j یہ الفاظ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کون شخص؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک تو وہ شخص کہ اپنی زندگی میں بوڑھے ماں باپ کو پائے اور ان کی خدمت کرکے جنت حاصل نہ کرے۔

حضور ﷺ نے بوڑھے کی قید اس لئے بڑھا دی کہ اگر ماں باپ خود جوان ہیں تو اول تو وہ اس کے محتاج نہیں ہوں گے جیسے اس کے پیر ہاتھ چلتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر بھی چلتے ہیں۔

دوسرے ان کی خدمت سے دل بھی نہیں گھبراتا۔ اس لئے اگر ان کی کچھ خدمت بھی کردی تو کچھ بڑی بات نہیں بخلاف بوڑھے ماں باپ کے کہ وہ اس کے محتاج ہوتے ہیں اور چونکہ اکثر قوی بالکل کمزور ہوجاتے ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتے

(۱) لم اجد الحدیث فی ’’موسوعۃ اطراف الحدیث‘‘

اور اکثر کام مرضی کے موافق نہیں ہوتے تو تنگ مزاج بہت ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ایسے ماں باپ کی خدمت کرنا بوجہ ان کی معذوری کے ضروری ہے اور ان کے تنگ مزاجی (۱) سے تنگ ہوجانا اور نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ مگر اکثر آدمی تنگ ہونے لگتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ طفولیت و عالم احتیاج کو بھول جاتا ہے کہ اس وقت والدین نے کیسے کیسے ناز اٹھائے ہیں اگر وہ یاد رہیں تو بڑا نفع ہو۔

ماں باپ کی شفقت

ایک بنئے کی حکایت مشہور ہے اس نے اپنے بڑھاپے میں ایک مرتبہ اپنے ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ اول تو اس سوال پر دل میں بہت خفا ہوئے کہ اس لغو سوال کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر خیر تہذیب سے کام لے کر بتلا دیا کہ ابا جان کوا ہے۔ بنئے نے پھر پوچھا کہ بھائی! یہ دیوار پر کیا چیز ہے؟ صاحبزادہ نے کہا کہ ابھی تو بتلا دیا تھا کہ کوا ہے۔ تیسری بار اس نے پھر پوچھا کہ دیوار پر کیا ہے تو صاحبزادہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے چپکے پڑے رہو۔ اس پر بنئے نے اپنا بھی (۲) کھاتا منگوایا اور کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادہ دیکھو! تم نے ایک سو بار مجھ سے اپنے بچپن میں یہی سوال کیا تھا۔ اور میں نے ہر مرتبہ محبت سے جواب دیا تھا۔ تم دو ہی بار میں گھبرا گئے۔

شبہ کا جواب

لیکن شاید کوئی شخص یہ کہے کہ صاحب بوڑھوں کی تنگ مزاجی سے ناگواری تو امر طبعی ہے اگر اس پر بھی باز پرس ہے تو سخت مشکل کی بات ہوگی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ امور طبعیہ پر خدائے تعالیٰ نے کہیں باز پرس

(۱) نازک مزاجی (۲) روزنامچہ جس میں ہر روز کے احوال قلم بند کرتا تھا۔

نہیں فرمائی۔ باز پرس امور اختیاریہ میں ہے۔ کلام مجید اس شبہ کا خود ازالہ فرمارہا ہے پارہ سبحان الذی میں حقوق والدین کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے ﴿رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِکُمْ ۭ اِنْ تَکُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا﴾

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجیوں سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے یہ تو امر طبعی ہے اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جائے اس میں معذور ہو لیکن خدائے تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخش دیتا ہے۔

صاحبو! ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے۔

اگر غور کریا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں ہر ہر بات کے وہ وہ مخفی پہلو لئے گئے ہیں کہ دوسرے سے مربوط ہیں مگر افسوس ہے لوگ کلام اللہ کو رسمی طور پر پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک شخص تو رغم انفه کا محل یہ ہوا۔ دوسرا وہ جس کے سامنے میرا نام آئے اور وہ درود نہ پڑھے۔

ماہ رمضان کی فضیلت

تیسرے وہ شخص کہ رمضان آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی یعنی ایسے عمل اور توبہ نہ کرلی جس سے گناہ معاف ہوجاتے۔ ایک دوسری حدیث میں بھی مغفرت سے رمضان کے تعلق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

(هو شهر اوله رحمة واوسطه مغفرة واٰخره عتق من النيران)(۱)

''یہ وہ مہینہ ہے (جس کا پہلا حصہ) رحمت دوسرا حصہ مغفرت اور آخری حصہ) دوزخ سے آزادی ہے''

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ سراپا رحمت ومغفرت ہے۔ پس اس میں انسان اپنی مغفرت کا سامان کرے اور مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ نیک عمل کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغفرت کی تحصیل امر اختیاری ہے چنانچہ خدا تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ○ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ﴾(۲)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کو متقی لوگوں کے واسطے تیار کیا گیا ہے۔ تو جو شخص اس راستے پر چلے اور مقرر شدہ قانون پر عمل کرے گا وہ مغفرت کو حاصل کریگا۔ جو شخص ایسا نہ کرے گا محروم رہیگا۔ پس معلوم ہوا کہ مغفرت کا حاصل کرنا خود ہمارے اختیار میں ہے اور اگر ہم چاہیں اس کو حاصل کرسکتے ہیں کہ متقی بن جائیں۔

بے علم واعظوں کی غلطی

اس موقع پر بے علم واعظوں کی غلطی کا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ وعظوں میں کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات بالکل بے پرواہ ذات ہے۔ وہ چاہے تو ایک نکتہ میں بخش دے اور چاہے تو ایک نکتہ میں جہنم بھیج دے اور یہ بات ایسے طور سے کہتے ہیں جس سے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون نہیں۔ بلکہ یوں ہی اناپ شناپ بے تکے طور پر جو چاہتے

(۱) حدیث (۲) سورۃ آل عمران: ۱۳۳،۱۳۴۔

ہیں کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سننے سے اکثر لوگ بالکل مایوس ہوجاتے ہیں اور عبادت ریاضت سب چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لئے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کس نکتہ پر اچانک پکڑ ہوجائے اور ساری محنت برباد ہی جائے۔

اسی طرح اکثر لوگ خوب جی بھر کر معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون ہی نہیں ایک نکتہ پر عذاب ثواب کا مدار ہے تو اپنی خواہشات کو کیوں ترک کریں اور خواہ مخواہ کی مصیبت کیوں اختیار کریں ممکن ہے اسی میں سے کوئی نکتہ پسند آجائے کہ اس پر نوازش ہوجائے گویا کارخانہ خداوندی اینادنگر کی سلطنت ہے کہ جہاں سارے کام بے ڈھنگے ہی ہوتے ہیں۔

اینادنگر کا قصہ

مشہور ہے کہ چیلہ گرو سفر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے نام پوچھا تو اینادنگر معلوم ہوا۔ جس کے معنی ہیں بے اتفاقی کا شہر، اشیاء کا نرخ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اناج سے لے کر گھی دودھ تک ہر ہر چیز سولہ سیر روپیہ کی ملتی ہے۔

یہ سن کر چیلہ تو بہت خوش ہوا کہ خوب گھی دودھ کھا کر فربہ ہوں گے (۱) مگر گرو نے کہا کہ بھائی اس جگہ قیام مناسب نہیں۔ یہ شہر تو بہت ہی بے تکا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے میں کچھ امتیاز ہی نہیں۔ مگر چیلہ نے اصرار کیا۔ آخر رہ پڑے۔

چند روز میں سیر کرتے کرتے عدالت کی طرف پہنچے دیکھا کہ ایک مقدمہ راجہ صاحب کے اجلاس میں درپیش ہے اور لوگوں کا ہجوم ہے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کوئی چور مدعی ہے مہاجن (۲) مدعا علیہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم دونوں چوری

(۱) موٹا تازہ ہوجاؤں (۲) ساہوکار۔

کرنے اس کے گھر گئے۔ نقب لگایا۔ میرا رفیق اندر جانے لگا تو دیوار اوپر سے آپڑی مرگیا قصاص چاہتا ہوں۔ مدعا علیہ سے باز پرس ہوئی کہ وہ دیوار ایسی کیوں بنائی گئی۔ اس نے کہا معمار سے پوچھئے بنانے والا وہ ہے۔ وہ بلایا گیا اس نے کہا گارہ دینے والے سے پوچھا جائے۔ اس کو بلایا اس نے کہا کہ سقہ (۱) نے پانی ڈال دیا جس سے گارہ پتلا ہوگیا۔ اس کو بلایا اس نے کہا سرکاری ہاتھی جھپٹا ہوا آتا تھا۔ خوف سے پانی زیادہ نکل پڑا۔ فیلبان (۲) کو بلایا۔ اس نے کہا ایک عورت آتی تھی پازیب (۳) سے پہنے اس کی جھنکار سے ہاتھی دوڑ پڑا۔ عورت کو بلایا۔ اس نے کہا سنار نے ایسا ہی باجا ڈال دیا۔ اس کو بلایا وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ حکم ہوا کہ پھانسی دیدی جائے۔ پھانسی کے لئے لے چلے۔ جب اسے پھانسی پر چڑھایا تو پھانسی کا حلقہ اس کے گلے سے بڑا نکلا۔ لوگوں نے آکر راجہ صاحب سے عرض کیا کہ حلقہ اس کے گلے سے بڑا ہے۔

راجہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دیدو۔ غرض موٹے آدمی کی تلاش شروع ہوئی۔ اتفاق سے مجمع بھر میں اس چیلے سے زیادہ موٹا کوئی نہ نکلا آخر اسی کو تجویز کیا گیا۔ اب تو چیلہ صاحب بہت گھبرائے اور گرو سے کہا کہ خدا کے لئے بچاؤ۔ اس نے جواب دیا میں نہ کہتا تھا یہاں رہنا اچھا نہیں آخر نتیجہ دیکھا۔

آخر گرو نے یہ تدبیر نکالی کہ پھانسی کے وقت خود بڑھ کر کہا کہ صاحبو! اس کو پھانسی نہ دو، مجھ کو دیدو۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ اس وقت میں نے جوتش (۴) میں جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت جو شخص پھانسی دیا جائیگا وہ

(۱) ماشکی (۲) ہاتھی چلانے والے (۳) پیر میں بجتا ہوا (۴) ستاروں کی چال سے جو معلوم کیا تو پتہ چلا کہ۔

سیدھا بیکنٹھ (۱) میں جائیگا۔ راجہ صاحب نے جو یہ سنا تو بڑھ کر فرمایا کہ اچھا جب ایسی بات ہے تو ہم کو پھانسی دیدو تاکہ جنت ہمیں حاصل کرلیں۔ چنانچہ راجہ صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ خس کم جہاں پاک صادق ہوا۔

تو ان نیم واعظوں کے ایسے بہانوں سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی بھی دوسرا اپنا دنگر ہے۔

قانون خداوندی

صاحبو! یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا بھی ایک قانون ہے۔ عذاب کا بھی ایک قانون مقرر ہے ثواب کا کام تو یہی ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے وسارعو الآیۃ یعنی تقویٰ حاصل کرو اور مغفرت و جنت لے لو۔ تو معلوم ہوا کہ مغفرت ورحمت کا لینا بالکل ہمارے اختیار میں ہے اور نہ اگر اس کو اختیار میں نہ مانا جائے تو سارعوا کے کوئی معنی نہیں ہوں گے کیونکہ تکلیف مالا یطاق محال ہے (۲) اور خلاف نص ہے اور یہاں امر ہوا مسارعت الی المغفرت کا تو ضرور وہ تحت الاختیار ہے۔ پس جب رمضان کی رحمت اور مغفرت کا حاصل کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کی تحصیل کی کوشش کرو اور اس وعید رغم انفہ کے مصداق نہ بنو۔

توبہ کی ترغیب

اگر یہ خوف ہو کہ توبہ ٹوٹ جائیگی اور گناہوں سے باز نہ رہ سکیں گے تو ہمت نہ ہارو۔ کیونکہ پھر توبہ کرلینا۔ دیکھو! اگر ایک کپڑا پھٹ جاتا ہے تو اس کو بالکل پھٹا ہوا نہیں چھوڑتے کہ سینے کے بعد پھر پھٹ جائیگا بلکہ سی کر پھر کام میں لاتے

(۱) جنت میں جائے گا (۲) ایسی بات کا پابند کرنا جس کی طاقت نہ ہو محال ہے اور خلاف قرآن وسنت ہے۔

ہیں۔ پس یہی حالت توبہ کی ہے کہ محض اس کے ٹوٹنے کے احتمال سے اس کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس وقت پھر توبہ کرلینا چاہیے باب توبہ بند نہیں ہوا۔ بلکہ اگر دن میں سو دفعہ بھی توبہ ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کرلو۔ مایوس نہ ہو جاؤ خوب کہا ہے ؎

باز آ بازآ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر وگبر وبت پرستی باز آ
ایں درگہ مادرگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی بازآ

’’پھر آؤ پھر آؤ تم جس حالت میں ہو چلے آؤ اگرچہ کافر ہو یا آتش پرست ہو یا بت پرست ہو چلے آؤ ہمارا یہ دربار ناامیدی کا دربار نہیں ہے (اگر سو مرتبہ توبہ توڑ چکے ہو جب بھی چلے آؤ‘‘

بلکہ اسی ترک توبہ ہی کی وجہ سے ہم کو معاصی پر زیادہ جرأت ہوگئی ہے کیونکہ جو شخص توبہ کرتا رہے گا۔ اس کے دل میں عظمت خداوندی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہے گی۔ یہ بڑا سبب ہے معاصی (۱) سے رک جانے کا برخلاف اس شخص کے جو کبھی توبہ نہ کرے گا۔ وہ خدا کو بالکل بھول جائے گا اور جب اس کی عظمت پیش نظر نہ ہوگی تو کچھ بھی اس سے ہو جائے بعید نہیں۔

ختم قرآن پر شیرنی

یہ مضمون اس عشرہ اخیرہ کے متعلق تھا اور ایک بات اس کے متعلق یاد آئی۔ چونکہ بعض لوگوں کو اس کی ضرورت ہوگی اس لئے اس کا بیان کردینا بھی اس مقام پر مناسب ہے۔ بات اگرچہ بہت پرانی ہے اور بہت دفعہ لوگوں کے سامنے تقریراً تحریراً پیش ہو چکی ہے مگر چونکہ اکثر لوگوں نے اس کو دل سے بھلا دیا ہوگا۔ اس وقت پھر اعادہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس عشرہ میں اکثر مساجد میں قرآن

(۱) گناہ۔

شریف ختم ہوگا۔ اس میں اکثر لوگ پڑھنے والوں کو کچھ دیا کرتے ہیں۔ سو یہ لینا چھوڑ دو۔ دوسرا اکثر مساجد میں ختم کے دن شیرنی تقسیم ہوتی ہے اس میں جو گڑ بڑ ہوتی ہے سبھی جانتے ہیں اور ان گڑ بڑوں کی وجہ سے جو شرعی قباحتیں اس میں پیدا ہوجاتی ہیں ان کو بھی متعدد مرتبہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت ان کے دہرانے کا وقت ہے نہ چنداں ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس کو بھی چھوڑ دو۔

دیکھو! اس کی بدولت بیچارے بعض غرباء پر سخت بار ہوجاتا ہے۔ اس انتظام کے متعلق بعض غریب جلا ہوں نے شکریہ میں یہ کہا کہ ہم بہت ممنون ہیں۔ کیونکہ ہم کو چندہ دینے کی مصیبت سے بچالیا۔ معلوم ہوا کہ لوگوں پر چندہ لینے سے بار ہوتا ہے بتلایئے یہ کیونکر جائز ہوگا۔ بعض رئیسوں نے مجھ سے کہا کہ آپ غریبوں کو منع کیجئے لیکن امیروں کو منع کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ خیال بالکل لغو ہے اس لئے کہ اگر امیروں نے چھوڑ دیا تو غریبوں کو چھوڑنا کچھ مشکل نہیں۔

بعض مساجد ایسی بھی ہیں کہ ان میں چندہ سے شیرنی تقسیم نہیں ہوتی لیکن وہاں دوسری خرابیاں ہوتی ہیں مثلاً ریاء و نمود کے لئے تقسیم کرنا۔ عوام الناس اور بچوں کے ہجوم سے مسجد کی بے حرمتی ہونا۔ لڑکوں کا حصہ مانگنے میں بلاوجہ پٹنا۔ غرض اس قسم کی بہت سی خرابیاں ہیں کہ زیرک آدمی ان کو خود سمجھ سکتا ہے۔

ایک مرتبہ بریلی میں قرآن سنانے کا اتفاق ہوا۔ ختم کے روز میرے بھائی نے تقسیم شیرنی کے لئے کہا۔ میں نے منع کیا لیکن انہوں نے کہا کیا مضائقہ ہے ان کا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو خود ان خرابیوں کا مشاہدہ ہوجائے۔ چنانچہ میں خاموش ہورہا شب کو شیرنی تقسیم کی گئی۔ اور انہوں نے اپنے

اہتمام سے خود تقسیم کی۔ لوگوں کے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعد تقسیم خود کہا کہ آپ کی رائے بہت صائب تھی۔ واقعی یہ خرافات کبھی نہ کرنے چاہئیں اور اس کا احساس ان کی دانش مندی کی دلیل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود خرابیاں سمجھ جانے کے بعد اپنے خیال سے باز نہیں آتے اور اس کو نہیں چھوڑتے۔

یہ احکام تھے اس عشرہ اخیرہ کے متعلق۔ ان سب کو یاد رکھنا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ ان پر پورے طور پر عمل ہوجائے اور جو لوگ مجمع میں حاضر نہیں ہیں ان کو بھی پہنچادینا چاہیے اور خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائے۔

اللھم تقبل منا اٰمین بحرمة جاہ سید المرسلین۔ (۱)

خلیل احمد تھانوی